اصلاحی تقریریں

عمل پر ابھارنے والی جامع، مؤثر اور دلپذیر تقاریر
علماء، خطباء اور عوام کے لیے یکساں مفید

جلد پنجم

مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
مولانا اعجاز احمد صمدانی
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

بیت العلوم
۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور، فون [illegible]

پیش لفظ

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مجھ جیسے ناچیز کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں تو اس قابل بھی نہ تھیں کہ ان کو "تقریریں" کہا جاتا، چہ جائیکہ انہیں "اصلاحی تقریریں" کا عظیم الشان نام دے کر کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ لیکن اہل محبت کا حسن ظن ہے کہ وہ ان کو ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کر لیتے ہیں۔

عزیز القدر مولوی محمد ناظم سلمہ نے جو دار العلوم کراچی کے ہونہار فاضل، اور "جامعہ اشرفیہ لاہور" کے مقبول استاذ ہیں، کئی سال سے ان ٹیپ شدہ تقریروں کو قلم بند کروا کر اپنے ادارے بیت العلوم لاہور سے شائع کرنے کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے اور اب تک اس سلسلے کے پانچ درجن سے زیادہ کتابچے شائع کر چکے ہیں، اور اب ان میں سے کچھ مضبوط کتابچوں کا ایک مجموعہ "اصلاحی تقریریں (جلد پنجم)" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ انہوں نے اور ان کے رفقائے کار نے

بڑی کاوش اور احتیاط سے کام لیا ہے اور ذیلی عنوانات بڑھا کر ان کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو شرف قبولیت سے نوازے اور ان کے علم وعمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے، اور اس کتاب کو قارئین کے لئے نافع بنا کر ہم سب کے لئے صدقہ جاریہ بنادے اور "بیت العلوم" کو دینی اور دنیاوی ترقیات سے مالا مال کردے۔

واللہ المستعان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ ملک و
بیرون ملک ایک جانی پہچانی علمی اور روحانی شخصیت ہیں۔ آنجناب ملک کی مشہور دینی
درسگاہ ''دارالعلوم کراچی'' کے مہتمم اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک فعال ممبر ہونے
کے علاوہ کئی جہادی، اصلاحی اور تعلیمی تنظیموں کے سرپرست ہیں۔ آپ مفسر قرآن مفتی
اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فرزند ارجمند اور عارف باللہ
حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحبؒ کے ممتاز اور اخص الخواص خلفاء میں سے ہیں۔
ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو حسن خطابت
سے خوب خوب نوازا ہے۔ ہر موقع پر پُراثر اور دلنشین پیرائے میں ہر سطح کے سامع کو
بات سمجھانا حضرت کا خصوصی کمال ہے جو اس قحط الرجال کے دور میں کہیں کہیں نظر آتا
ہے۔ نیز بزرگوں کی صحبت کی برکت سے لوگوں کی اصلاح کا جذبہ کہ کسی طرح لوگ
روحانی طور پر درست ہوجائیں حضرت کے بیانات کا لازمی حصہ ہے۔ گویا حضرت
کے خطبات و بیانات شریعت وطریقت کا ایک حسین امتزاج ہوتے ہیں۔ جن میں
عالمانہ تحقیق، تجربات زندگی کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صوفی، شیخ اور مربی کی

سوچ بھی جلوہ نما ہوتی ہے۔

الحمد للہ "بیت العلوم" کو یہ شرف حاصل ہوا کہ پہلی مرتبہ حضرت کے ان اصلاحی، پرمغز اور آسان بیانات کو حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے تجویز کردہ نام "اصلاحی تقریریں" کے نام سے شائع کر رہا ہے۔ اصلاحی تقریریں جلد اول، دوم، سوم اور چہارم کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد اب جلد پنجم آپ کے سامنے ہے۔ جس میں حضرت کے کچھ بیانات بعض کراچی اور دوسرے ملکی و غیر ملکی مقامات کے شامل ہیں۔ اس کتاب کی ضبط و ترتیب کا کام مولانا اعجاز احمد صمدانی (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی) نے انجام دیا ہے۔ اس میں حتی الوسع ضبط و ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے اور آیات واحادیث کی تخریج بھی کردی گئی ہے، پھر بھی اگر کوئی غلطی نظر سے گزرے تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ "بیت العلوم" کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو صحت عافیت عطا فرمائے تاکہ ہم حضرت کے بیانات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

آمین

والسلام

محمد ناظم اشرف

مدیر بیت العلوم

اجمالی فہرست

فہرست

موت ایک حقیقت

جہاد اور حقوق والدین

❁اتباعِ سنت کے ثمرات❁

حسن اخلاق کی حقیقت اور اس کے فضائل

رشتہ داروں کو صدقہ دینے کے فضائل

والدین اور رشتہ داروں سے بدسلوکی ایک ہولناک گناہ

رشتے داروں کے دوستوں سے حسن سلوک کی اہمیت

اللہ والوں کی صحبت میں رہنے کے ثمرات

ہر نعمت ایک آزمائش

☆حبِ فی اللہ کے فضائل☆

﴿اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ﴾

موت ایک حقیقت

موت ایک حقیقت

خطبۂ مسنونہ:

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا ○ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔

اما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ○ وقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ ○

(ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء فی ذکر الموت، حدیث نمبر ۲۲۳۰)

تمہید:

بزرگان محترم اور برادران عزیز!

پچھلے کئی جمعوں سے حقوق العباد اور اس کی تفصیلات کا بیان چل رہا تھا۔ اس کے بعد گذشتہ دو جمعوں میں انصاف قائم کرنے اور امانت کے لئے سچی گواہی دینے کے متعلق قرآنی ارشادات کی تشریح بیان کی گئی۔ اسی کے ضمن میں ووٹ کی شرعی حیثیت کا بیان ہوا، جس میں ناچیز نے یہ بتایا کہ ووٹ کی حیثیت گواہی اور شہادت کی ہے اور شرعاً صحیح گواہی دینا فرض ہے اور جھوٹی گواہی دینا کبیرہ ہے حتیٰ کہ ایسا کبیرہ گناہ ہے کہ حدیث میں شرک کے ساتھ اس کا ذکر موجود ہے۔ اور اسی طرح چند اور ضروری احکام کا ذکر بھی سامنے آیا۔

ہمارے معاشرے کا افسوسناک پہلو:

لیکن ہمارے معاشرے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لوگ مسائل کو صرف جاننے کی حد تک محدود رکھتے ہیں، اپنی عملی زندگی میں اس کی فکر نہیں کرتے۔

کس کو نہیں معلوم کہ رشوت لینا دینا حرام ہے، مگر لے دے رہے ہیں، کس کو نہیں معلوم کہ ناپ تول میں کمی کرنا حرام ہے، لیکن ایسا ہو رہا ہے۔ کس کو نہیں معلوم کہ سود لینا دینا حرام ہے مگر پھر بھی سود کا بازار گرم ہے۔ کسے نہیں معلوم کہ کام چوری ناجائز اور حرام ہے لیکن ہمارے ملک میں کام چوری کا دور دورہ ہے۔ ادارے سرکاری ہوں یا پرائیویٹ ہر جگہ کام چوری عام ہے۔

صرف مسئلہ جان لینا کافی نہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ صرف زبانی جمع خرچ ہو لینے سے صرف مسئلہ بیان

غافل! میں تاریکیوں اور اندھیروں کا گھر ہوں، میں تیرے انتظار میں ہوں، میرے اندر رہنے والے بچھو اور سانپ بھی تیرے منتظر ہیں۔ اور اللہ کی رحمتیں بھی منتظر ہیں۔ میرے پاس تیاری کر کے آ۔ اگر تیاری کر کے آئے گا تو میری بانہیں تیرے لئے کھل جائیں گی، تاریکی روشنی سے بدل جائے گی، تنگی وسعت میں تبدیل ہو جائے گی اور اللہ کے عذاب کے بجائے اس کی بے پناہ رحمتیں تیرا استقبال کریں گی۔ لیکن اگر تو تیاری کئے بغیر آ گیا تو یاد رکھ! میرے بچھوؤں اور سانپوں کے ذریعے تیرے اوپر دردناک عذاب مسلط کیا جائے گا۔

قبر یاد رکھنے کا اثر:

قبر ہماری انتظار میں ہے لیکن ہم قبر کو بھول چکے ہیں۔ اس قبر اور آخرت کو بھلانے کی وجہ سے انسان گناہوں پر جرأت کرتا ہے۔ اور اگر قبر سامنے ہو اور میدان قیامت کا منظر اور آخرت کا عذاب یاد رہے تو انسان گناہ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے سامنے یہ تصور جمنے لگتا ہے کہ دنیا تو چند روزہ ہے، معلوم نہیں کہ کتنے دن، کتنے گھنٹے، کتنے منٹ بلکہ کتنے سیکنڈ میں ختم ہو جائے گی۔ اس تصور کے ہوتے ہوئے گناہ یا تو ہوتے نہیں، اگر ہوں تو بہت کم ہوتے ہیں اور ان میں بھی اکثر چھوٹے ہوتے ہیں اور اگر کبھی بڑا گناہ (گناہ کبیرہ) سرزد ہو جائے تو توبہ کئے بغیر چین نہیں آتا۔

ایسے آدمی سے دوسروں پر ظلم اور زیادتی نہیں ہوتی کیونکہ ظلم کرنے سے پہلے اسے اپنی قبر یاد آ جاتی ہے، آخرت کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور یہ خیال آ جاتا ہے کہ اگر ذرہ برابر بھی ظلم کیا تو قیامت کے روز اس کا حساب چکانا پڑے گا۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ

ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾ (الزلزال: ۷-۸)

"جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی، وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا۔"

اور جسے اپنی قبر یاد نہ رہے، موت یاد نہ رہے، میدان حشر کا تصور بالکل جاتا رہے، پل صراط سے گذرنے کا منظر یاد نہ رہے، وہ گناہ پہ گناہ کرتا جاتا ہے۔ اور مسلسل گناہوں کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی یہاں تک کہ اچانک ملک الموت (موت کا فرشتہ) آ کر پکڑ لیتا ہے۔

خدائی ڈھیل اور پکڑ:

قرآن مجید میں ہے:

"وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ" (الاعراف: ۱۸۳)

"میں اپنے نافرمان بندوں کو ڈھیل دیتا رہتا ہوں۔ میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔"

جب آدمی نافرمانی میں حد سے بڑھنے لگتا ہے تو بعض مرتبہ اسے ڈھیل دی جاتی ہے۔ دیکھنے میں تو اس کے مال و اسباب میں اضافہ ہوتا ہے، عہدے بھی ملتے رہتے ہیں، ظاہری عزت بھی ملتی رہتی ہے، ان چیزوں کی وجہ سے وہ گناہوں میں اور مست ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے۔ اور یہ ڈھیل اس لئے دی جاتی ہے کہ ان سب گناہوں کے بدلے ایک ہی مرتبہ پکڑ لیا جائے۔ اور اللہ کی پکڑ ایسی سخت ہے کہ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ لہذا اگر ایک شخص گناہوں کے باوجود ڈرنے کے بجائے خوش ہوتا ہے اور مزید آگے بڑھتا ہے تو سمجھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے۔

کرلیا تھا اب وہ اس کا نہیں رہا، حتیٰ کہ وہ دستخط نہیں کرسکتا۔ انگوٹھا بھی نہیں لگا سکتا لیکن اگر کوئی دوسرا شخص اس کا انگوٹھا لے کر کسی کاغذ پر لگا دے اور تاریخ بھی ڈال دے تو یہ نشان بھی دنیا کی کوئی عدالت تسلیم نہیں کرے گی۔ کیونکہ اب یہ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ معلوم ہوا کہ انسان جسم اور روح دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جب تک یہ دونوں ہیں تو انسان، انسان ہے۔ اس کے بعد وہ ایک لاش ہے۔

موت کی سختی سے پناہ مانگنے کی تلقین:

تو وہ روح جو ایک عرصہ تک ہمارے جسموں کے اندر رہتی ہے، جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوتی ہے، ریشے ریشے میں پیوست ہوتی ہے جب یہ جدا ہوتی ہے تو تکلیف بہت ہوتی ہے۔ اس لئے اس تکلیف سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرض الموت میں یہ دعا فرماتے تھے۔

﴿اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَسَكَرَاتِ الْمَوْتِ﴾

"اے اللہ میں موت کی سختیوں اور تکلیفوں سے پناہ مانگتا ہوں۔"

روح جسم سے غیر متعلق نہیں ہوتی:

لیکن روح جدا ہونے کے بعد جسم سے بالکل غیر متعلق نہیں ہو جاتی بلکہ جب انسانی جسم کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو روح کا تعلق پھر اس سے قائم ہو جاتا ہے، جسم کو جو عذاب ہوتا ہے، اس کی تکلیف روح بھی محسوس کرتی ہے اور روح پر جو تکلیف آتی ہے اس کے اثرات جسم پر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اگر انعامات ہوں تو

اس کا تعلق بھی جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں جو بھی آیا، جانے کے لئے آیا:

یہ سارا منظر ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ جب یہ منظر انسان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو آدمی شیطان بن جاتا ہے، چنگیز خان بن جاتا ہے، درندہ بن جاتا ہے، بچھو اور سانپ بن جاتا ہے، انسانیت کے جامے سے نکل جاتا ہے۔ اور اگر یہ منظر سامنے رہے تو وہ اسے یہ سبق دیتا رہتا ہے کہ اس عارضی زندگی کی خاطر آخرت کی دائمی زندگی کو برباد نہ کرو۔ اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ یہاں پر تم چند دنوں کے لئے آئے تھے۔

یہاں جو بھی آیا ہے، جانے کے لئے آیا ہے، رہنے کے لئے نہیں آیا۔ اگر موت سے کوئی مستثنیٰ کیا جاتا تو انبیاء کرام علیہم السلام اس دنیا سے رخصت نہ ہوتے، سید المرسلین امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام اس دنیا سے تشریف نہ لے جاتے لیکن موت نے نہ کسی بادشاہ کو چھوڑا اور نہ کسی فقیر کو، نہ کسی نبی اور ولی کو چھوڑا اور نہ کسی عام انسان کو، نہ کسی پہلوان کو چھوڑا اور نہ کسی کمزور کو۔ موت کسی کو بھی نہیں چھوڑتی، یہ ہر حال میں آکر رہے گی۔

سلیمان علیہ السلام کے ایک ساتھی کا واقعہ:

امام غزالی رحمہ اللہ نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک اجنبی آیا اور حاضرین میں سے ایک کو بار بار گھورنے لگا۔ کچھ دیر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔

جس شخص کو وہ گھور رہا تھا۔ اسے بڑا ڈر لگا۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ

السلام سے عرض کیا کہ وہ شخص مجھے گھور رہا تھا۔ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ میں زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ہوا کو مسخر کر رکھا ہے۔ براہ کرم آپ ہوا کو حکم دیں کہ وہ مجھے اڑا کر ہندوستان کے آخری کنارے پہنچا دے۔ (حضرت سلیمان علیہ السلام ملک شام میں ہوتے تھے) آپ نے ہوا کو حکم دیا اور ہوا سے اڑا کر ہندوستان کے آخری کنارے چھوڑ آئی۔

اگلے دن وہ اجنبی پھر آیا۔ سلیمان علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ کل تم ہمارے ایک ساتھی کو گھور رہے تھے، کیا بات تھی؟ وہ بولے کہ میں ملک الموت (موت کا فرشتہ ہوں) کل جب میں یہاں آیا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ یہ شخص یہاں (شام میں) بیٹھا ہے اور مجھے آج آدھی رات کے وقت ہندوستان کے آخری کنارے پر اس کی روح قبض کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ حکم ملا ہے کہ وہ مجھے ہندوستان کے آخری کنارے پر ملے گا۔ وہاں میں اس کی روح قبض کر لوں۔ اس حیرت کی وجہ سے میں اسے گھور رہا تھا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ وہیں موجود تھا۔

موت کا آنا یقینی ہے:

موت کا وقت تو بہر حال مقرر اور طے شدہ ہے اور اس طے شدہ وقت میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے بقدر تاخیر نہیں ہو سکتی اور جلدی بھی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ایسی یقینی چیز ہے کہ دنیا کے کسی مذہب کو اس سے اختلاف نہیں، کسی فلسفے اور سائنس کو اس سے انکار نہیں اور کوئی بھی شخص اس کا منکر نہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود اکثر لوگ اسے بھولے ہوئے ہیں۔ اپنے پیاروں کو کندھا دیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک روز انہیں بھی کندھا دیا جائے گا۔ کتنوں کی نماز جنازہ میں شریک ہوتے ہیں لیکن یہ تصور حاضر نہیں ہوتا کہ ایک روز ان کی نماز جنازہ بھی ادا

کی ایسے کی۔ ہم نے کتنوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا ہے، کتنوں کی قبر پر مٹی ڈالی ہے، ان کے مرنے پر ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں تک غمگین رہے ہیں لیکن پھر اس موت کو بھول جاتے ہیں جو ہمارے پاس بھی آنے والی ہے، اور اسی بھول کی وجہ سے سارے جرائم وجود میں آتے ہیں۔ اگر یہ موت یاد رہے تو دنیا میں امن و امان قائم ہو جائے گا، قتل و غارت گری کا خاتمہ ہو جائے گا، عزت و حرمت بچ جائے گی، لوگوں کو ان کے حقوق ملیں گے، کوئی کسی کا حق نہیں مارے گا۔ اگر کبھی مارے گا بھی تو زیادہ نہیں دبائے گا، دیر تک نہیں مارے گا، بالآخر اسے واپس کرنے کی توفیق ہوگی۔

مراقبۂ موت:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ "موت کا مراقبہ کیا کرو"۔ موت کے مراقبے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی موت کا تصور جمایا کرو۔ اس کا طریقہ بھی ذکر فرمایا۔ وہ یہ کہ روزانہ کسی وقت (مثلاً رات کو لیٹتے وقت یا صبح اٹھنے کے وقت یا کسی فرصت کے وقت) دو چار منٹ اپنی موت کا تصور کیا کرو۔ (تین چار منٹ بھی بہت ہیں اس لئے کہ تصور کی رفتار بہت تیز ہے۔ اس کے برابر کوئی رفتار ابھی تک دریافت ہی نہیں ہوئی، روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہے) اور تصور اس طرح کرو کہ یہ سوچو کہ ایک وقت ایسا آنے والا جب میری موت قریب ہوگی، میرے رشتے دار، عزیز و اقارب، دوست بھائی، ماں باپ، بیوی بچے میری زندگی سے مایوس ہو چکے ہوں گے، اور وہ بے کسی کے عالم میں مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔ اسی حالت میں میری روح نکال لی جائے گی۔ ملک الموت میری روح میرے جسم کے ریشے ریشے سے نکالیں گے۔ پورے گھر میں ایک سوگ ہوگا۔ لوگوں کو اطلاع دی جائے گی۔ نہلانے والے غسل دیں گے۔ پھر کفن دیا جائے گا۔ کفن میں لپیٹ کر میرا جنازہ

اٹھایا جائے گا۔ جس طرح اب تک میں دوسرے جنازوں کو کندھے دیتا رہا ہوں، اسی طرح آج دوسرے لوگ میرے جنازے کو بھی کندھا دے رہے ہوں گے۔ میرے بھائی، میرے والد، میرے بیٹے، میرے دوست، میرے عزیز و قریب سب مجھے کندھوں پہ لے جا رہے ہوں گے۔ نماز جنازہ ہوگی۔ پھر مجھے اس گڑھے میں لے جایا جائے گا جو میرے انتظار میں ہے۔ وہاں نہ روشنی ہے اور نہ کوئی کھڑکی ہے اور نہ کوئی ساتھی ہے اور نہ ہی کھانے پینے کا سامان ہے۔ وہ مجھے لٹا کر اور منوں مٹی میرے اوپر ڈال کر واپس چلے آئیں گے۔ اس کے بعد میں ہوں گا، میری قبر ہوگی اور میرا عمل ہوگا۔ جیسا میرا عمل ہوگا، ویسے ہی وہ قبر میرے لئے ہو جائے گی۔

مراقبۂ موت کے ثمرات:

اگر ہم روزانہ یہ مراقبہ کرتے رہیں (اور یہ صرف دو تین منٹ کا عمل ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بھی تعمیل ہو جائے گی کہ "لذتوں کو توڑنے والی چیز موت کا کثرت سے ذکر کیا کرو" اور چند ہی دنوں میں آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آ رہی ہے۔ آپ کے والدین، بہن بھائی اور بیوی بچے محسوس کریں گے کہ آپ کے اندر ایک انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اور آپ ایک عظیم اور محبوب انسان بنتے جا رہے ہیں۔ آپ کی ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی قبر کی تیاری اور گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

جہاد اور حقوقِ والدین

﴿جہاد اور حقوق والدین﴾

خطبۂ مسنونہ:

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم.

اما بعد!

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ: أَقْبَلَ رَجُلٌ إِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أُبَایِعُکَ عَلَی الْہِجْرَۃِ وَالْجِہَادِ أَبْتَغِی الْأَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی. قَالَ: فَہَلْ لَکَ مِنْ وَالِدَیْکَ أَحَدٌ حَیٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ بَلْ کِلَاہُمَا. قَالَ: فَتَبْتَغِی الْأَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَارْجِعْ إِلٰی وَالِدَیْکَ، فَأَحْسِنْ صُحْبَتَہُمَا.

(صحیح مسلم، کتاب البر، باب تقدیم بر الوالدین علی التطوع [illegible])

حدیث کا مفہوم:

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز!

والدین اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک سے متعلق بات چل رہی تھی۔ اسی سلسلے کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: "میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، ہجرت اور جہاد پر اور ثواب چاہتا ہوں"۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں، دونوں زندہ ہیں، (والد بھی اور والدہ بھی)۔

آپ نے فرمایا کہ اپنے والدین کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے ساتھ اچھی طرح رہو۔ (صحیح مسلم، باب تقدیم بر الوالدین علی التطوع، کتاب البر والصلۃ، ۴۶۲۳)

بیعت کسے کہتے ہیں؟

بیعت ایک قسم کا معاہدہ ہوتا ہے۔ اب بھی بیعت کا ایک طریقہ جاری ہے۔ جسے ہمارے ہاں "پیری مریدی" کہا جاتا ہے۔ اس میں لوگ اپنے مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں یعنی اس بات کا معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم دین پر عمل کریں گے اور آپ کی ہدایات کے مطابق آپ کی زندگی میں کام کریں گے۔

بیعت کی اقسام:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی یہ بیعت ہوتی تھی بلکہ اس دور میں بیعت کی مختلف قسمیں پائی جاتی تھیں۔

۱۔ بیعت علی الاسلام۔
۲۔ بیعت علی الجہاد۔
۳۔ مخصوص افعال کی پابندی پر بیعت (بیعت تصوف)
۴۔ بیعت خلافت۔

ایک قسم یہ تھی کہ کوئی شخص مشرف باسلام ہوتا تو وہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر قبولیت اسلام کی بیعت کرتا یعنی یہ معاہدہ کرتا کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور اب اپنی زندگی اسلام کے عقائد اور احکام کے مطابق گذاروں گا۔ یہ بیعت علی الاسلام کہلاتی ہے۔

بعض مرتبہ جہاد کے موقعوں پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے بیعت لی کہ تم اپنے امیر کی اطاعت کرو گے اور جہاد فی سبیل اللہ پورے اخلاص کے ساتھ کرو گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ خواتین آئیں، انہوں نے چند مخصوص افعال کی پابندی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے[1]۔ اس قسم کی بیعت آج بھی جاری ہے۔ مرشد کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے وہ اسی پر ہوتی ہے کہ شریعت کے فرائض و واجبات بجالائیں گے اور آپ کی رہنمائی میں یہ کام کریں گے۔ یہ بیعت شریعت کے مطابق ہے اور اس میں بڑی خیر و برکت ہوتی ہے۔

ایک اور قسم کی بیعت یہ تھی کہ جب کوئی خلیفہ یا امیر المومنین مقرر ہوتا تو لوگ اس کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کرتے کہ ہم آپ کو امیر المومنین مانتے ہیں اور جائز کاموں میں آپ کی اطاعت کریں گے۔

ہجرت اور جہاد پر بیعت کرنے کا مطلب:

اس حدیث میں اسی تیسری قسم کی بیعت کا ذکر ہے۔ ہجرت اور جہاد پر

---

[1] سورۃ الممتحنہ: ۱۲

بیعت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آؤں گا اور جہاد میں شریک ہوں گے۔ اور ان دو کاموں پر آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے بیعت فرمانے کے بجائے یہ سوال کیا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے۔ جب اس نے بتلایا کہ دونوں زندہ ہیں تو آپ نے اسے اس کے والدین کی طرف لوٹ جانے کا فرمایا اور ان سے حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ "اپنے والدین کے پاس جاؤ اور انہی کے سلسلے میں جہاد کرو"۔ (صحیح مسلم ۲/۳۱۲) یعنی جو محنت اور کوشش تم جہاد میں جا کر کرتے ہو، وہی محنت اور کوشش ان کے حقوق کی ادائیگی میں کرو۔

والدین کی خدمت ہجرت اور جہاد سے بہتر ہے:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی خدمت کرنا ہجرت سے بھی بہتر کام ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہے۔ ہجرت اور جہاد کے کتنے فضائل قرآن کریم اور احادیث میں مذکور ہیں۔ درجنوں سے زیادہ آیات قرآنی اور بیسیوں احادیث ان کے فضائل سے بھری ہوئی ہیں لیکن اس سب کے باوجود آپ نے اسے جہاد اور ہجرت کرنے کے بجائے والدین کی خدمت کا حکم دیا۔

ہجرت سے متعلق مسئلے کی تفصیل:

اس مسئلے کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی تو اس وقت مکہ مکرمہ کے تمام مسلمانوں پر ہجرت فرض عین تھی۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ ہجرت نہ

کرتے۔ ہر مسلمان پر لازم تھا کہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر رہے۔ الا یہ کہ کوئی شخص اتنا سخت مجبور ہو اور مکہ مکرمہ سے نکل نہ سکتا ہو تو وہ مستثنیٰ تھا۔

یہ حکم فتح مکہ تک رہا۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو مسلمانوں کی وہاں حکومت قائم ہو گئی تو اب مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے کی فرضیت ختم ہو گئی۔ اگر کوئی شخص مدینہ طیبہ میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں رہنا چاہتا تو وہ اجازت مانگتا۔ اگر آپ کی طرف سے اجازت ملتی تو وہ مدینہ منورہ میں آجاتا ورنہ وہیں رہ جاتا۔ بظاہر ان صحابی کا واقعہ اس وقت کا ہے جب فتح مکہ ہو چکا تھا اور ہجرت کی فرضیت نہیں رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صحابی مکہ مکرمہ کے علاوہ کسی اور علاقے کے ہوں۔

جہاد سے متعلق حکم کی تفصیل:

یہ بات تو ہجرت کے متعلق تھی۔ جہاد کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ بعض حالات میں ہر مسلمان مرد پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں عورتوں پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں صرف مریض، نابالغ بچے اور معذور افراد مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ باقی لوگوں پر جہاد ایسے ہی فرض ہو جاتا ہے جیسے پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ یہ حکم دو صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ دشمن نے کسی مسلمان بستی پر حملہ کر دیا تو اب اس بستی کے تمام مسلمانوں پر فرض عین ہے کہ وہ اس دشمن کا مقابلہ کریں۔ اگر مرد کافی نہ ہوں تو عورتیں بھی شریک جہاد ہوں اور ایسی حالت میں عورتیں اپنے شوہروں سے اجازت لینے کی بھی پابند نہیں۔ اور اگر اس بستی کے مرد و عورت کافی نہ ہوں تو قریب ترین بستی کے لوگوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا حاکم یہ اعلان کرے کہ تمام لوگ جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوں یا کوئی خاص عمر متعین کر دی کہ اس عمر کے تمام لوگ جہاد کے لئے نکلیں۔ ایسی صورت میں جن جن لوگوں پر وہ اعلان عائد ہوتا ہے، ان سب پر جہاد فرض عین ہو جائے گا۔ جیسے غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دیا۔ صرف تین صحابہ کسی عذر معتبر کی وجہ سے اس جہاد میں شریک نہ ہوئے جس کی وجہ سے ان پر عتاب ہوا اور بعد میں ان کی توبہ قبول کی گئی۔ قرآن و حدیث میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔[1]

جہاد کس وقت فرض کفایہ ہوتا ہے؟

ان دو صورتوں کے علاوہ دیگر مواقع پر جہاد فرض عین نہیں ہوتا بلکہ فرض کفایہ ہوتا ہے مثلاً یہ کہ کسی بستی پر دشمن نے حملہ کیا تو اس بستی والوں پر تو فرض عین ہوگا لیکن باقی بستیوں پر فرض کفایہ ہوگا۔ یعنی اگر یہ اندازہ ہو کہ اس بستی کے لوگ کافی ہو جائیں گے تو دوسری بستیوں کے افراد پر جہاد فرض نہ ہوگا لیکن اگر یہ اندازہ ہو کہ اس بستی کے لوگ ناکافی ہیں تو قریبی بستی کے لوگوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا اور اس بستی والے بھی کافی نہ ہوں تو پھر دوسری بستی والوں پر فرض ہو جائے گا لیکن اگر کچھ لوگوں کا جانا کافی ہو سب کا جانا ضروری نہ ہو تو باقی لوگوں پر فریضہ عائد نہ ہوگا۔ اگر وہ نہ جائیں تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔

جہاد فرض عین نہ ہو تو والدین کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں

یہ صحابی جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لینے آئے تھے۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے سورۃ التوبہ آیت ۱۱۸، صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک (۴۴۱۸)

ہر مسلمان مرد و عورت پر اتنا علم دین حاصل کرنا فرض عین ہے کہ جس کی روز مرہ کے کاموں کے لئے ضرورت ہے جیسے نماز، روزہ اور پاکی ناپاکی کے مسائل، اللہ تعالیٰ مال دے دے تو زکوٰۃ کے مسائل، شادی ہو جائے تو نکاح و طلاق کے مسائل، تجارت کرنے لگے تو اپنی تجارت کے متعلق مسائل وغیرہ۔ ان سب کے مسائل کو بقدر ضرورت سیکھنا فرض ہو جاتا ہے لیکن پورا عالم دین بننا فرض عین نہیں ہوتا۔ اور ایسے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ اپنے شعبے سے متعلق ضروری احکام علماء کرام سے پوچھیں اور ان کے مطابق عمل کریں۔ جب یہ بات ہے کہ ہر مسلمان پر پورا عالم دین بننا فرض نہیں تو اس کے لئے والدین کی اجازت کے بغیر عالم بننا جائز نہیں بلکہ ایسی صورت میں لازم ہے کہ ان کے پاس رہے، ان کی خدمت کرے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔

تبلیغ کے حکم میں تفصیل:

تبلیغ کے کام میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں سے کسی گناہ کو ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس وقت تو اس پر فرض ہے کہ اس گناہ کو روکنے کی کوشش کرے۔ اگر ہاتھ سے روک سکتا ہے تو ہاتھ سے روکے، ہاتھ سے نہیں روک سکتا تو زبان سے روکے۔ اور اگر زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو اسے گناہ سمجھے اور یہ نیت رکھے کہ اگر کبھی قدرت ہوئی تو اس برائی کو روکنے کی کوشش کروں گا۔

سہ روزہ اور چلہ وغیرہ میں جانے کا حکم:

اتنی حد تک تو تبلیغ فرض عین ہے، اس سے زیادہ فرض عین نہیں کہ ہر شخص گھر سے نکلے اور دوسروں کو نیکی کے کاموں کی ترغیب دے اور گناہوں سے بچنے کی

اجازت دیدے۔ یہ کام اگرچہ بہت عظیم اور ثواب والا کام ہے لیکن فرض عین نہیں۔ اور جب فرض عین نہیں تو ماں باپ کی اجازت کے بغیر اس کے لئے نکلنا بھی جائز نہیں، نہ سہ روزہ میں، نہ دس روزہ میں، نہ چلے میں، نہ چار مہینے اور نہ ایک سال میں۔

حد سے تجاوز:

اس معاملے میں مجاہدین بھی حد سے تجاوز کرتے ہیں کہ وہ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے چلے جاتے ہیں۔ علم دین کے سلسلے میں بھی بعض طلبہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ماں باپ سے اجازت لئے بغیر مدارس میں داخلہ لے لیتے ہیں اور تبلیغ کے کام میں بھی یہ کثرت سے ہوتا ہے کہ والدین راضی نہیں ہیں تین روزہ یا دس روزہ کے لئے چلے گئے اور پھر وہیں سے خط بھیج دیا کہ اب میں چلہ کے بعد آؤں گا، دوسرا خط آیا کہ میں نے چار مہینے کر دیئے پھر وہاں سے خط آیا کہ اب میں سال بعد آؤں گا۔ یہ سب شرعی حدود سے تجاوز کرنے والی باتیں ہیں۔

والدین کی اجازت کے بغیر نفلی حج کرنا جائز نہیں:

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام نام ہے بندگی کا، اللہ رب العالمین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے آگے گردن جھکا دینے کا۔ اپنی مرضی اور شوق کو پورا کرنا اسلام نہیں۔ آپ نے حج فرض ادا کر لیا، اب نفلی حج کرنے کا شوق پیدا ہوا تو والدین کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہ ہوگا۔ جو گیا ہے تو گنہگار ہوں گے۔ حالانکہ نفلی حج کتنی عظیم عبادت اور ثواب کا کام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا حج فرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے حجۃ الوداع کے موقع پر ادا کیا تھا۔ اس کے بعد جب تک آپ کی والدہ حیات رہیں، کبھی حج کے لئے نہیں گئے جا کر

مدینہ طیبہ سے حج کے لئے جانا کوئی زیادہ مشکل نہ تھا لیکن والدہ کی خدمت کو چھوڑ کر حج پر جانا گوارا نہیں کیا۔

اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالانا ہی بندگی ہے

شریعت نے جس حال میں جو حکم دیا، اُسے بجالانا عبادت ہے، اس کے خلاف اپنی مرضی کرنا عبادت نہیں ہو سکتا بلکہ بعض مرتبہ اُسے کرنا جائز بھی نہیں ہوتا جیسے مغرب کی نماز کے بارے میں شریعت نے حکم دیا کہ تین فرض پڑھو۔ اگر کوئی شخص تین کے بجائے چار رکعت پڑھے گا تو وہ قبول نہ ہوگی بلکہ الٹا منہ پر ماردی جائے گی۔ اسی طرح عام حالات میں یہ حکم ہے کہ نماز کے دوران سر کو ڈھانپنا چاہیے لیکن حج کے دوران سر کو ننگا رکھنے کا حکم دیا گیا۔ حتیٰ کہ حج میں اگر کوئی مرد سر پر کپڑا ڈال لے تو اس پر دم[1] واجب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عام حالات میں خوشبو لگانا پسندیدہ ہے لیکن حج کے دوران خوشبو لگانا جائز نہیں۔ اگر لگائے گا تو دم دینا پڑے گا۔

اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ نماز میں سر ڈھانپنا اور خوشبو لگانا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اس لئے میں حج میں بھی سر ڈھانپوں گا اور خوشبو لگاؤں گا تو اس کا یہ فعل مقبول نہ ہوگا بلکہ الٹا اس کے منہ پر مار دیا جائے گا کیونکہ اس وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اس کے برخلاف ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بجالانا ہی بندگی ہے اور اسی کا نام دینداری ہے۔ اگر اس کے برعکس کریں گے تو وہ دین نہیں ہوگا۔

حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ مشہور تابعی ہیں۔ آپ یمن کے رہنے والے

---

[1] دم واجب ہونے کا مطلب ہے کہ ایک جانور جیسے بکرا، دنبہ، بھیڑ وغیرہ حرم میں قربانی کی [illegible]

تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ وہاں سے سفر کر کے مدینہ طیبہ تشریف لا سکتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے شرفیاب ہو کر صحابی ہونے کی فضیلت حاصل کر سکتے تھے۔ صحابی ہونا اتنا اونچا مقام ہے کہ اس امت میں نبی کے بعد اس جیسا کوئی مقام نہیں۔ لیکن آپ کی والدہ بوڑھی تھیں اور آپ کے علاوہ ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپ نے بارگاہ رسالت میں حاضری رہنے کے بجائے والدہ کی خدمت کو ترجیح دی حالانکہ یمن کے اور کئی حضرات جن میں حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما شامل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

دل کس قدر چاہتا ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرے لیکن اس وقت چونکہ آپ پر والدہ کی خدمت فرض عین تھی، اس لئے آپ نے دل کی خواہش کو قربان کیا اور حکم شرعی کو سر پر رکھا۔ بندگی اسی کا نام ہے۔ تقاضائے دین اسی کا نام ہے۔ اس بندگی کے نتیجے میں آپ کو یہ مقام ملا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: دیکھو! ایک شخص ہے جس کا نام اویس ہے۔ قبیلہ قرن سے اس کا تعلق ہے۔ یمن کا رہنے والا ہے۔ اس کی فلاں فلاں علامتیں ہیں۔ وہ اپنی والدہ کی خدمت میں رہتا ہے، اگر کبھی تمہاری اس سے ملاقات ہو تو تم اس سے اپنے لئے مغفرت کی دعا کرانا۔

(صحیح مسلم، باب من فضائل اویس القرنی)

چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جہاد میں جانے کے لئے مختلف علاقوں اور شہروں سے لشکر آیا کرتے تھے۔ جب یمن کے مجاہدین آتے تو آپ ان سے پوچھتے کہ تم میں سے کوئی اویس تو نہیں۔ کئی دفعہ پوچھا۔ ایک مرتبہ اویس قرنی

بھی ان دستوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان کے اندر وہ ساری علامات موجود تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب تمام علامات سے پہچان لیا تو ان سے درخواست کی کہ تم میرے لئے مغفرت کی دعا کرو۔ حالانکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد ہونے کے ساتھ ساتھ عشرہ مبشرہ میں سے بھی ہیں۔ اور آپ کا نام لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ عُمَرُ فِي الْجَنَّةِ (عمر جنت میں ہے) اور معراج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروق کا جنت میں محل بھی دیکھا۔ اس سب کے باوجود اس شخص سے دعا کی درخواست کی جارہی ہے۔ جس نے ماں کی خدمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر ترجیح دی۔ اور اپنی دلی خواہش پر عمل کرنے کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے آگے گردن جھکا دی۔

محمود و ایاز کا واقعہ:

اسلام نام ہی گردن جھکانے کا ہے۔ اسلام کے لغوی معنی ہیں گردن نہادن (گردن جھکا لینا)۔ آقا نے جو حکم دے دیا اس کے آگے گردن جھکا لینے کا نام اسلام ہے۔ آپ نے محمود و ایاز کا واقعہ سنا ہوگا۔ محمود غزنوی افغانستان کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔ اس کا ایک غلام تھا جسے "ایاز" کہا جاتا تھا۔ "ایاز" اپنی عقلمندی، ذہانت، شرافت اور وفاداری کی وجہ سے بادشاہ کا محبوب ہو گیا حتی کہ بعض مرتبہ بادشاہ اس کی بات کو اپنے وزیروں بلکہ وزیر اعظم کی بات پر بھی فوقیت دے دیا کرتا تھا۔ وزیروں کو حسد ہونے لگا۔ بادشاہ یہ جتانے کے لئے کہ ایاز کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا، کبھی کبھی ان کا امتحان لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بھرے دربار میں وزیر اعظم کو حکم دیا کہ فلاں پیالہ جو فلاں ملک کے بادشاہ نے تحفے کے طور پر بھیجا تھا، وہ حاضر کیا جائے۔ وہ پیالہ

بہت ہی قیمتی جواہر کا بنا ہوا تھا۔ کروڑوں اربوں کی مالیت کا تھا۔ وہ لا کر رکھا گیا۔ ایک ہتھوڑا منگوا لیا۔ ایک وزیر سے کہا کہ یہ ہتھوڑا لے کر پیالے کو توڑ ڈالو۔ اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ کہا کہ بادشاہ سلامت! جان کی امان پاؤں تو ایک عرض کروں۔ بڑا قیمتی پیالہ ہے، توڑنے سے بڑا نقصان ہوگا۔ بادشاہ نے دوسرے کو حکم دیا۔ وہ بھی کپکپا گیا۔ تیسرے نے بھی معذرت کر دی۔ آخر تک سب وزراء کے اندر اس پیالے کو توڑنے کی ہمت پیدا نہ ہوئی۔ سب سے آخر میں ایاز کو حکم دیا۔ اس نے ہتھوڑا اٹھایا اور اسے پیالے پر دے مارا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔ بادشاہ نے لہجہ بدل کر کہا: ایاز! یہ تو نے کیا کیا؟ اتنا قیمتی پیالہ توڑ دیا۔ ایاز بولا: بادشاہ سلامت! مجھ سے اگر غلطی ہوئی ہے تو معافی چاہتا ہوں لیکن میں نے یہ سوچا کہ ایسے ہزاروں پیالے توڑے جا سکتے ہیں مگر بادشاہ کا حکم نہیں توڑا جا سکتا۔

سب سے بڑی دانشمندی:

اس کے جواب پر غور کیجئے کہ پہلے معافی مانگی یہ نہیں کہا کہ ابھی تو آپ نے حکم دیا تھا کہ اسے توڑ ڈالئے اور اب ناراض بھی ہو رہے ہیں۔ اور پھر حکم بجا لانے کی حکمت کیسے عمدہ انداز میں بیان کی کہ اس جیسے ہزاروں پیالے ٹوٹ سکتے ہیں، بادشاہ کا حکم نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہی وہ صفت تھی جس نے ایاز کو محمود غزنوی کا چہیتا غلام بنایا تھا۔ اللہ رب العزت کے ساتھ بھی مسلمان کا یہی معاملہ ہونا چاہئے۔ جس وقت اور جس حال میں اللہ کا حکم آجائے، اُسے صدق دل سے مان کر عمل کرنے والا ہو۔ اس کے خلاف کوئی عقلی دلیل اس کے آگے کارگر نہ ہو۔ سب سے بڑی دانشمندی یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو بجا لاؤ۔ جہاد چھوڑنا پڑے، جہاد چھوڑ دو۔ مدرسہ چھوڑنا پڑے، مدرسہ چھوڑ دو، خانقاہ چھوڑنی پڑے، خانقاہ چھوڑ دو، تبلیغ

چھوڑنی پڑے، تبلیغ چھوڑ دو، نفلی حج کو چھوڑنا پڑے، اسے چھوڑ دو لیکن غیرت کے باوجود دین کی خدمت کرنا نہ چھوڑو، شریعت کے احکام کو نہ چھوڑو۔ یہی تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل ہے اور یہی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین٥
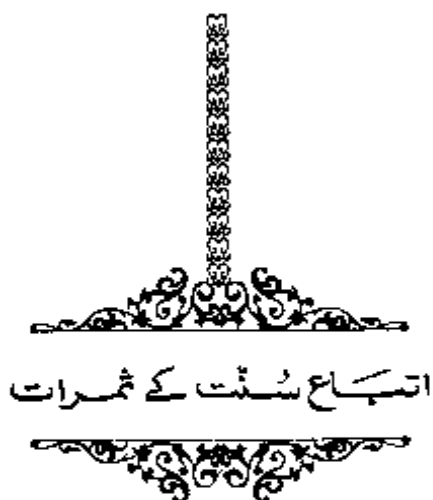
اتباعِ سنّت کے ثمرات

﴿اتباعِ سنت کے ثمرات﴾

خطبہ مسنونہ:

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ ونتوکل علیہ. ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا ○ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا و سندنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ اجمعین. وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا.

امابعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

تمہید:

عرضِ مطلب:

آپ حضرات سے خطاب کرنے کے لئے جمعہ کا دن مقرر ہوا لیکن مشاغل کی وجہ سے اس کی پابندی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلے جمعہ کو بیان کرنے کا ارادہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مولانا طارق جمیل صاحب کو بھیج دیا تو ہم نے ان کو غنیمت سمجھا کہ ان سے خطاب سے آپ حضرات کو فائدہ ہو جائے۔

زمانہ طالبعلمی کی اہمیت:

طالبعلمی کا زمانہ ایسا ہے کہ اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صادق آتا ہے۔

﴿نعمتان مغبونٌ فیهما کثیر من الناس الصحة والفراغ﴾ (بخاری کتاب الرقاق، ترمذی کتاب الزہد)

"دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت دوسرے فرصت"

طالبعلمی کے زمانے میں انسان کی صحت بھی بھرپور ہوتی ہے، کبھی زکام ہو جائے تو وہ الگ بات ہے مگر طالبعلمی کا دور نوجوانی کا زمانہ ہوتا ہے جو طاقت سے بھرپور ہوتا ہے اور اس دور میں فرصت بھی بہت ہوتی ہے۔

آپ کہیں گے کہ ہمارے پاس فرصت کہاں ہے، ہمیں تو بہت مصروفیت ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کو مشغولات کا پتہ اس وقت چلے گا جب آپ پر ذمہ داریاں آئیں گی۔ ہم بھی جب طالبعلمی کے زمانے میں یہاں دارالعلوم میں پڑھتے تھے تو ہم

اپنے آپ کو بہت مصروف سمجھتے تھے لیکن اب پتہ چلا کہ مشغولیت کس کو کہتے ہیں۔ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ صبح سے اٹھنے کے بعد کام شروع کرتے ہیں، رات کا ایک بج جاتا ہے۔ عشاء کے بعد اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ اب لیٹ جائیں، اب لیٹ جائیں لیکن فرصت نہیں ہوتی۔ اگر کبھی لیٹ بھی جائیں تو نیند نہیں آتی۔ اگلے دن کے کاموں کے بارے میں تفکرات وخیالات گھیرتے ہیں۔ رات کو جب سوتے ہیں تو نجانے کتنے لوگوں کو کہہ کر سوتے ہیں کہ فلاں فلاں کام کل کو یاد کرا دینا، یادداشت کے پرچے بھی لکھ کر رکھتے ہیں۔ بالآخر نیند کی گولی کھانی پڑتی ہے، تب جا کر نیند آتی ہے۔ لیکن جب طالب علم ہوتے تھے تو ہمیں یاد ہے کہ دورۂ حدیث کے سال میں پہلے گھنٹے میں مولانا مفتی رشید احمد صاحب کا بخاری شریف کا درس ہوتا تھا اور دوسرے گھنٹے میں مولانا اکبر علی صاحب مسلم شریف پڑھاتے تھے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ یہاں سے مفتی رشید احمد صاحب سبق پڑھا کر نکلے اور ادھر مولانا اکبر علی صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ ہماری نیند کی ہوتی کیونکہ راتوں کو نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ وہیں برآمدے میں تکیہ، چادر کے بغیر لیٹ جاتے، درسگاہ تک پہنچنے میں حضرت کو چار منٹ لگتے تو ہم تین منٹ کے لئے سو جاتے اور چوتھے منٹ میں اٹھ جاتے۔

تفکرات اور خیالات نہ ہونے کی وجہ سے نیند اپنے قابو میں تھی کہ جب چاہا سو گئے اور جب چاہا اٹھ گئے۔ لیکن اب کاموں کا اتنا ہجوم اور اتنے تفکرات ہیں کہ نیند کی گولی کھائے بغیر نیند نہیں آتی۔ آپ لوگوں کو یہ تفکرات نہیں۔ آپ کو اگرچہ مصروفیت ہے لیکن یہ مصروفیت اس طرح کی ہے کہ جب تک کام میں لگے ہوئے ہیں تو دماغ مصروف ہے لیکن جب کام سے نمٹ گئے تو دماغ فارغ ہو جاتا ہے لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ کام سے اٹھنے کے بعد بھی دماغ فارغ نہیں ہوتا۔

گویا اس دور میں آپ کو صحت اور فراغت کی نعمتیں ملی ہوئی ہیں اور یاد

رکھئے کہ یہ نعمتیں پھر لوٹ کر نہیں آئیں گی۔

وہ جوانی دیکھی جو نہ آئے کے چا
وہ بڑھاپا دیکھا جو نہ جائے، آکے

اس وقت کی قدر کریں:

جوانی جا کر واپس نہیں آتی اور بڑھاپا آ کر واپس نہیں جاتا۔ آج کل آپ کے پاس نوجوانی کا زمانہ ہے۔ یہ بہت تیزی سے گذرتا ہے۔ یہ بہت جلدی ختم ہوجائے گا۔ اس کی قدر کریں کیونکہ عام طور پر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ بہت سے لوگ ان کے بارے میں دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت اور دوسرے فراغت۔

جوانی میں عام طور پر لوگ کاموں کو ٹال دیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں کہ چلو یہ کام کل کرلیں گے، اگلے دن کہتے ہیں کہ چلو آئندہ کل کرلیں گے، پرسوں کرلیں گے، آئندہ ہفتے کرلیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کام ٹلتا جاتا ہے اور کبھی انجام نہیں پاتا اور جب بڑھاپا آ جاتا ہے تو پھر کام کرنے کی ہمت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا آپ اس جوانی کی قدر کریں اور اس سے خوب کام لیں۔

ہمارے طلبہ اصلاح کے طالب ہیں:

ہمارا معاملہ تو وہ ہے جو میں نے آپ سے عرض کیا اس وجہ سے تو غم ہوجاتے ہیں مگر اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ ماشاء اللہ، ہمارے طلبہ یاد دہانی کراتے رہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان سے اصلاحی

خطاب ہو۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ علامت
اس بات کی ہے کہ ہمارے طلبہ اصلاح کے طالب ہیں۔

اصلاح کی اہمیت وضرورت:

اور اصلاح کی ضرورت اتنی زیادہ ہے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ واقعہ یہ ہے
کہ ہمارے بزرگوں کے نزدیک تعلیم سے زیادہ تربیت ضروری ہے۔ تعلیم کے لئے
بہشتی زیور، تعلیم الاسلام وغیرہ کا مطالعہ بھی کافی ہے۔ اگر کوئی شخص ان کتابوں میں
لکھے ہوئے مسائل کو معلوم کرکے ان پر عمل کرلے تو آدمی متقی اور پرہیزگار بن سکتا
ہے لیکن اصل مقصد تربیت کا ہے۔ جب تربیت نہیں ہوتی تو علم بھی بیکار ہوجاتا ہے۔

تربیت حاصل نہ کرنے کے نقصانات:

دارالعلوم کے ایک فاضل اسلام آباد میں مدرس ہیں۔ مجھ سے ان کا اصلاحی
تعلق ہے۔ ہزارہ کے قریب ان کا اصل گاؤں ہے۔ آج ان کا اور ان کے دو ساتھی
کا خط آیا۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ آپ سے ایک اہم مشورہ یہ کرنا ہے کہ ہمارے
گاؤں میں بدعتیں اور خلاف شریعت رسمیں بہت ہیں۔ قبائلی تعصبات کی وجہ سے قتل
وغارت گری بھی عام ہے۔ عورتوں کو اغوا کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ طرح طرح کی
جاہلانہ رسمیں جو زمانہ جاہلیت میں کفار عرب کے اندر تھیں۔ اس طرح کی رسمیں
ہمارے گاؤں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے علماء جو
مدارس سے فارغ ہوکر گاؤں میں جاتے ہیں۔ وہ خود کسی بزرگ سے تربیت یافتہ نہیں
ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خود ان رسموں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ مال کے لالچ میں
پڑجاتے ہیں۔ قبائلی تعصبات کا شکار ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ خود لڑائی

جتنا اضافہ کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کے شعبے کے ذریعے آپ جتنی علمی تحقیقات کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ مفتی طلبہ دارالافتاء میں جا کر فقہی مسائل کی مشق کرنا چاہیں تو ان کے لئے اس کے بہترین مواقع ہیں اور دارالطلبہ میں رہتے ہوئے اسلامی معاشرت کے احکام پر عمل کرنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔

تربیت حاصل کرنے کا آسان طریقہ: اتباع سنت

اگر آپ دارالطلبہ میں رہتے ہوئے وہاں کی زندگی کو سنت کے سانچے میں ڈھال دیں تو یہی آپ کی تربیت ہے۔ آپ کو ولی بننے کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہیں دارالعلوم کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے آپ اللہ کے ولی بن سکتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ہر کام میں سنت کی رعایت رکھیں۔ چلنے میں، پھرنے میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، بیت الخلاء آنے جانے میں، وضو کرنے میں، نماز پڑھنے میں، مسجد آنے جانے میں، رات کو سونے میں، صبح کو اٹھنے میں، کپڑے بدلنے میں، کھانا لینے کے لئے جانے میں، کھیل کود میں غرضیکہ تمام معاملات کو سنت کے تابع کر دیں تو آپ ولی کامل بن جائیں گے ان شاء اللہ اور ولی کامل بھی ایسے بنیں گے کہ آپ کو دیکھ دیکھ کر کافر بھی مشرف باسلام ہوں گے اور بڑے بڑے مرتکب بدعتی اور طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا لوگ ہدایت حاصل کریں گے۔

اتباع سنت کا ایک عظیم فائدہ: اللہ تعالیٰ کی محبت:

اپنے آپ کو سنت کے سانچے میں ڈھالیں۔ اپنے آپ کو اسی طرح صاف ستھرا رکھیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفائی کا اہتمام کرتے تھے۔ روایات

سے معلوم ہوتا ہے کہ دن میں نجانے کتنی مرتبہ آپ مسواک کرتے تھے۔ ہر نماز کے وقت مسواک فرماتے تھے، صبح کو اٹھنے کے وقت مسواک فرماتے تھے، تہجد میں اٹھتے تو مسواک فرماتے، کھانے کے وقت بھی مسواک فرمایا کرتے تھے۔ ہر وقت مسواک ساتھ رہتی تھی۔ دانت بالکل صاف ستھرے رہتے تھے۔ آپ کے جسم اطہر سے خوشبو پھوٹتی رہتی تھی۔ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ جس سے ملتے مسکرا کر بات کرتے تھے۔ محبت اور خیر خواہی سے بات کرتے تھے۔

یہ سب باتیں سنت نبوی میں داخل ہیں اور جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سنتوں کو اپنائے گا وہ ہر دلعزیز بن جائے گا اور لوگوں کی محبت کا مرکز بن جائے گا۔ کیوں بن جائے گا؟ اس لئے کہ قرآن مجید یہ بتلاتا ہے کہ ایسا آدمی تو اللہ کا محبوب بن جاتا ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران ۳۱)

''آپ فرما دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو اس محبت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔''

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل امین سے کہہ دیتے ہیں کہ دیکھو کہ میں اس بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ جبرئیل امین فرشتوں میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے محبت کرتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس کے بعد زمین میں بسنے والے لوگوں کے دلوں میں اس کی قبولیت آ جاتی ہے۔ ''یُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْقُلُوبِ''۔

کونسا عمل معتبر ہے؟:

خوب سمجھ لیجئے! ایک ہے قابلیت اور ایک ہے مقبولیت۔ کتابوں سے آپ کو قابلیت تو حاصل ہو جائے گی کہ محنت کرنے کی وجہ سے کتابوں کا مطلب سمجھ میں گے، شرح اور حاشیہ سمجھ لیں گے، مسائل کی دلیل جان لیں گے لیکن کتابوں سے مقبولیت نہیں آئے گی۔ مقبولیت تو عمل سے آئے گی اور عمل وہی معتبر ہے جو سنت کے تابع ہو ورنہ کان لم یکن ہے۔

''اتباع سنت'' سے ولایت حاصل ہوگی:

اللہ رب العزت کا کتنا کرم ہے کہ اس نے دین اتنا آسان بنایا ہے کہ آدمی کو ولی اللہ بننے کے لئے نہیں جنگل اور جزیرے میں جانے کی یا کسی ویرانے میں ڈیرہ ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ شریعت یہ کہتی ہے کہ انسانوں کے درمیان زندگی گزارو، اپنے روزمرہ کے کام کرو لیکن انہیں شریعت کی حدود کے اندر کرو۔ بس یہی ولایت ہے۔

آپ کا صبح سے لیکر شام تک کا معمول طے ہوا کیا ہے کہ پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھیں، صبح کو کچھ نہ کچھ تلاوت کریں، کمروں اور دریچوں کی صفائی، صبح کا ناشتہ پھر اسباق میں حاضری، دوپہر کا کھانا اور کچھ دیر کے لئے آرام، ظہر کے بعد پھر اسباق میں حاضری، عصر کے بعد تفریح اور کھیل، مغرب کے بعد مطالعہ اور عشاء کے بعد تکرار پھر سو جانا۔ یہ آپ کی روزمرہ کی زندگی ہے۔ اس کو سنت کے مطابق ڈھال لیجئے تو آپ اللہ کے ولی بن جائیں گے۔ مثلاً ان کاموں میں سے ایک کام ہے ''کھانا''۔ اس کے متعلق کئی سنتیں ہیں۔

مدرسے میں کھانا لینے سے متعلق سنتیں:

اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم ہے: "مطبخ سے کھانا حاصل کرنا"۔ عصر کی نماز کے بعد ہمارے ہاں چھوٹے طلبہ سلام پھیرتے ہی فوراً مطبخ کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ یہ عمل سنت کے خلاف ہے۔ سنت سے ثابت ہے کہ نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کچھ دیر بیٹھتے تھے، ذکر اور دعا فرماتے تھے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد امام کی تابعیت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جتنی دیر امام دعا کرتا ہے آپ بھی اتنی دیر دعا کریں لیکن بیٹھ کر کچھ ذکر اور دعا اپنے طور پر کریں کیونکہ فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت ہے[1] اور دعا مانگنا مستحب بھی ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر بیٹھ کر اس سنت کو ادا کریں۔ اس کے بعد کھانا لینے جائیں لیکن بھاگ کر نہ جائیں۔

دیکھئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: جماعت کی نماز میں شریک ہونے کے لئے بھاگ کر نہ آؤ۔ ظاہر ہے کہ آدمی نماز کے لئے اس لئے بھاگتا ہوا آتا ہے کہ رکعت یا تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ تکبیر اولیٰ یا رکعت چھوٹ رہی ہو لیکن بھاگتے ہوئے نہ آؤ۔ جب نماز کے لئے بھاگنے کی اجازت نہیں تو دوسرے کاموں کے لئے بھاگنے کی اجازت کیسے ہوگی؟ (ورزش کے لئے بھاگنا الگ چیز ہے کہ اس کا مقصد ہی بھاگنے سے حاصل ہوتا ہے) لیکن کسی اور کام کے لئے بھاگنا ادب سے

---

[1] ایک حدیث میں فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت مذکور ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:
عن ابی امامة قال: قیل یا رسول اللہ ﷺ ای الدعاء اسمع؟ قال: جوف اللیل الآخر ودبر الصلوات المکتوبة۔ رواہ الترمذی فی کتاب الدعوات۔

خلاف ہے)

اس کے بعد جب مطبخ میں پہنچیں تو فوراً قطار بنا کر کھڑے ہوں۔ قطار بھی وقار سے کھڑے ہوں، ایک دوسرے کو دھکا نہ دیں۔ دھکے نہ دیں، ایک دوسرے کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کریں، مل مل کر کھڑے نہ ہوں، فاصلے سے کھڑے ہوں تاکہ دوسرے کو ایذا نہ پہنچے۔ آپ کو یہ مسئلہ معلوم ہوگا کہ "ارض مباحہ" کے اندر جو شخص سب سے پہلے پہنچ جائے وہ اس جگہ کا حقدار ہو جاتا ہے۔ کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کو اس جگہ سے ہٹائے جیسے مسجد میں اگر ایک شخص آکر ایک جگہ بیٹھ جاتا ہے تو بعد میں آنے والے شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے کہے کہ تم اس جگہ سے اٹھو مجھے بیٹھنے دو، یہی حکم مطبخ کی قطار کا ہے۔ جو پہلے آکر آگے پہنچ گیا اس کو ہٹا کر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرنا بھی ناجائز ہے۔ جس جگہ جو کھڑا ہے، وہ اس کا حق ہے، وہاں سے ہٹانے کا کسی دوسرے کو اختیار نہیں ہے۔

کھانا لانے سے متعلق سنتیں:

کھانا لانے میں سنت یہ ہے کہ اسے ڈھک کر لائے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی ڈھکنا وغیرہ نہ ہو تو لکڑی سے ڈھانک دو۔ بعض طلبہ ڈھکنے کے بغیر برتن لاتے تھے۔ الحمد للہ اب اس کی پابندی کروائی جارہی ہے کہ ڈھکنا ساتھ ضرور لایا جائے، اس لئے کہ کھانے کو کھلا رکھنا سنت کے خلاف ہے۔ آج کل کے سائنس دان بھی اس کی ایک حکمت بتاتے ہیں کہ فضا میں بیماریوں کے جراثیم پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اگر ڈھکا نہ ہو تو جراثیم کھانے میں شامل ہو کر بیماریوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کی نیت سے کرنا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سراپا حکمتیں ہی حکمتیں ہیں۔ ان میں دین

﴿إِطْعَامُ الطَّعَامِ وَإِفْشَاءُ السَّلَامِ﴾ (مسند احمد بن حنبل ۱۹۹۰)

''کھانا کھلانا اور سلام کو پھیلانا۔''

برتن سے کھانا نکالنے سے متعلق سنتیں:

کھانا کھانے میں یہ بات سنت کے خلاف ہے کہ آدمی اتنا کھانا نکالے جو کھا نہیں سکتا۔ برتن میں صرف اتنا کھانا نکالے جتنا کھا سکتا ہو۔ زیادہ کھانا لینے کی صورت میں جو برتن میں سالن بچ جائے گا۔ وہ یا تو خراب ہو جائے گا یا اگر دوسرا آدمی کھائے گا تو اسے ذرا گھن آئے گی۔

اور پھر دوسرا ادب یہ ہے کہ جتنا کھانا نکالے اس کو بھی بڑی صفائی سے کھائے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ایک مرید تھے، والد صاحب کے دوست تھے، ہم انہیں تایا ابا کہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہمارے دارالعلوم دیوبند میں والد صاحب سے ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ مثلاً گھر سے چاولوں کی پلیٹ بھر کر آ گئی تو وہ ایسا کرتے کہ اس میں سے کچھ چاول اسی پلیٹ میں الگ کر لیتے اور وہ کھاتے۔ جتنے چاول کھانا ہوتے، وہ کھا لیتے، اور اس طرح صفائی کے ساتھ کھاتے کہ بالکل انگلی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا اور بقیہ چاولوں کو ہاتھ تک نہ لگاتے تاکہ بچا ہوا کھانا دوسرا آدمی آرام سے کھائے۔

آج کل عام طور پر بڑے برتنوں میں کھانا ہوتا ہے اور ساتھ چھوٹے چھوٹے برتن اور پلیٹیں وغیرہ ہوتی ہیں کہ کھانے والا اپنی ضرورت کے بقدر نکالے۔ اس میں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ صرف اتنا کھانا نکالا جائے جتنا کھانا ہو، زیادہ نہ نکالا جائے۔ زیادہ نکالے گا تو پلیٹ کیسے صاف کریگا حالانکہ پلیٹ صاف کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پلیٹ صاف کرنے اور انگلیوں کو چاٹنے

سے پہلے چاٹنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ ''تمہیں کیا خبر کہ تمہارے کھانے کے کون سے حصے میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے'' ہوسکتا ہے کہ کھانے کا جو جز پلیٹ سے کنارے لگا ہوا ہے یا انگلیوں سے لگا ہوا ہے، برکت اسی میں ہو۔

بیماریاں پھیلنے کی ایک وجہ:

آج کل بہت زیادہ بیماریاں پھیلنے کی میرے خیال میں ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ کھانے کی سنت پر عمل نہیں ہو رہا۔ اگر کھانے کی سنت پر صحیح طریقے سے عمل ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ کا قرب اور محبت بھی ملے گی اور صحت بھی ٹھیک رہے گی کیونکہ سنت میں سراپا طہارت، نفاست اور پاکیزگی ہے۔

''جان بچانا فرض ہے'':

بعض مرتبہ میزبان زبردستی زیادہ ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر زیادہ کھانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بزرگ کہیں تشریف لے گئے۔ میزبان نے پلیٹ میں کھانا زیادہ ڈال دیا۔ انہوں نے اپنی ضرورت کے بقدر کھا لیا۔ باقی بچ گیا۔ میزبان نے کہا: حضرت پلیٹ صاف کرنا سنت ہے۔ فرمایا: ہاں یہ سنت ہے لیکن جان بچانا فرض ہے۔

کھانے سے متعلق دیگر سنتیں:

اس کے علاوہ کھانے کے دوسرے آداب اور سنتیں یہ ہیں کہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کریں۔ ہاتھ دھو کر کھائیں۔ احترام سے بچھا کر کھانا کھائیں۔ جو کھانا بچ جائے تو اسے اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیں۔ نہ یہ خیال ہو کہ دوبارہ گرم کرکے کھائیں گے

تو پھر کچھ اپنے لئے بچا کر رکھ سکتے ہیں لیکن اسے ڈھانپ کر الگ جگہ رکھو کہ خراب نہ ہو۔

دوسری اہم سنت: سلام کرنا

دوسری اہم سنت جو یہاں ہم زندہ کر سکتے ہیں۔ وہ سلام کی سنت ہے۔ آج کل یہ رواج چل پڑا ہے کہ مصافحہ تو کرتے ہیں، سلام نہیں کرتے حالانکہ تاکید سلام کی آئی ہے۔ مصافحہ کی نہیں آئی۔ مصافحہ تو دو شرطوں کے ساتھ ہے۔ اول یہ کہ دوسرے آدمی کو اتنا موقع ہو کہ وہ مصافحہ کر سکے، دوسرے یہ کہ اس کا ہاتھ بھی خالی ہو۔ لیکن سلام کے یہ دو شرطیں ضروری نہیں بلکہ سلام کے آداب میں سے تو یہاں تک آیا ہے کہ مثلاً آپ دو ساتھی چلے جا رہے ہیں۔ راستہ میں دیوار آ گئی، پھر دوبارہ ملے تو پھر بھی سلام کریں۔ افشاء السلام شریعت کا پسندیدہ عمل ہے۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شاگرد رشید فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بازار تشریف لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ پورے بازار میں گھومے۔ جو بھی ملتا رہا اسے سلام کرتے رہے نہ کوئی چیز خریدی نہ فروخت کی اور نہ کسی چیز کا بھاؤ معلوم کیا اور نہ کسی دکان پر رکے۔ میں نے واپسی پر پوچھا حضرت! آپ بازار تشریف لے گئے تھے لیکن ویسے ہی واپس آ گئے؟ فرمایا ہم اس لئے گئے تھے کہ وہاں مسلمان ملیں گے، انہیں سلام کریں گے۔ یہ سنت پر عمل کرنے کا جذبہ اور شوق ہے۔

فجر کی سنتوں سے متعلق ایک اہم مسئلہ:

ایک اور اہم بات فجر کی سنتوں کے متعلق عرض کرنی ہے۔ سنتوں کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ جب تک نماز کھڑی نہ ہو، اس وقت تک مسجد میں پڑھی جا سکتی ہیں لیکن جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسجد میں سنتیں نہ پڑھی جائیں لیکن فقہاء کرام نے فجر کی سنتوں کے بارے میں اس حد تک اجازت دی ہے کہ اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے پہلے سنتیں ادا کر کے جماعت میں شریک ہو سکتا ہے تو سنتیں ادا کرے کیونکہ فجر کی سنتوں کی تاکید بہت زیادہ آئی ہے بلکہ باقی چار نمازوں کی سنتوں کے مقابلے میں ان سنتوں کی تاکید سب سے زیادہ ہے لہٰذا انہیں چھوڑنا یا قضا کرنا معمولی بات نہیں، اس لئے فقہاء کرام نے اس کی اجازت دی لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس میں پوری کوشش کی جائے کہ یہ سنتیں مسجد سے باہر ادا کی جائیں کیونکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں جماعت ہو رہی تھی اور ساتھ میں ایک صحابی نے سنتیں ادا کیں تو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر فرمائی۔ اس لئے فقہاء نے فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے باہر سنتیں ادا کی جائیں لیکن اگر باہر جگہ نہ ہو تو بالکل دروازے کے پاس جتنی جگہ دور ہو سکے وہاں ادا کرے۔ ہم نے ترکی میں دیکھا کہ وہاں پرانی مسجدوں میں مسجد سے ایک دو صف کے فاصلے پر چبوترے بنائے گئے ہیں۔ وہ شاید اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ اگر کسی نے فجر کی سنتیں پہلے نہ پڑھی ہوں تو وہاں ادا کریں۔ یہاں بھی ہم نے مسجد کے باہر صفیں بنوائی ہیں تاکہ وہاں سنتیں ادا کی جائیں۔ اکثر طلبہ وہیں پڑھتے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ بعض طلبہ مسجد کے اندر سنتیں پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے، نادانی کی بات ہے، اگر مسئلہ معلوم ہے تو یہ لاپرواہی غفلت کی بات ہے۔

سنت پر عمل کرنے اور کرانے کا احسن طریقہ:

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سنت کو زندہ کرنے کا اہتمام اس طرح کیا جائے کہ کوئی کسی پر تنقید نہ کرے۔ بڑے چھوٹوں کو محبت سے سمجھائیں۔ چھوٹے بڑوں سے ادب سے بات کریں۔ برابر کے ساتھ احترام کے ساتھ بات کریں۔ کسی سے غلطی ہو جائے تو چپکے چپکے سے اور تنہائی میں اس سے بات کریں۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" دین کا قطب اعظم ہے۔ آپ اس کی مشق یہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی چلے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں چلے میں جانے سے منع نہیں کرتا۔ چھٹیوں میں اگر والدین اجازت دیں تو چلے میں ضرور جائیں۔ بہت فائدہ ہوتا ہے بڑا خیر و برکت کا کام ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ چلہ تو ہوگا چھٹیوں میں، آپ یہاں اپنے روزمرہ کی زندگی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عادت ڈالیں۔ کھانا کھانے کے دوران کسی سے سنت کے خلاف عمل ہو تو اسے احترام اور حکمت کے ساتھ یاد دلا دیں۔ اسی طرح کسی اور عمل میں کسی ساتھی کا عمل سنت کے خلاف ہو تو احترام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ ایسا کرنے سے آپ چند ہفتوں کے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ ہمیں اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

حسن اخلاق کی حقیقت اور اس کے فضائل

﴿حسنِ اخلاق کی حقیقت اور اسکے فضائل﴾

خطبۂ مسنونہ:

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم۔

امابعد!

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَ خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ (رواہ الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح کتاب الرضاع، وفی المشکوۃ، کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء، وما لکل واحدۃ من الحقوق، الفصل الثانی، رقم الحدیث ۳۲۶۴)

علامہ نووی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب "ریاض الصالحین" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اسے ہم نے کافی عرصے سے شروع کر رکھا ہے۔ آج کی مجلس میں یہ باب شروع کر رہے ہیں کہ شریعت میں "دوسرے کے ساتھ حسن سلوک" کا کیا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہ خواتین کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو کیا کیا ہدایات دی ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَ خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَاءِهٖ﴾

''سب سے مکمل ایمان والے لوگ وہ ہیں جو اخلاق میں سب سے اچھے ہیں اور تم میں سے سب سے اچھے مرد وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ سب سے اچھے ہیں۔''

''حسن اخلاق'' کسے کہتے ہیں؟

''خلق'' اصل میں عادت کو کہتے ہیں۔ ''حُسْنُ الْخُلُقِ'' کا مطلب ہوا ''اچھی عادت۔ اچھے اخلاق'' حسن اخلاق کیا ہے؟ اس کا حاصل اور لب لباب جو علماء کرام نے لکھا ہے، تین چیزیں ہیں۔

۱۔ بَذْلُ الْمَعْرُوْفِ

۲۔ کَفُّ الْاَذٰی

۳۔ طَلَاقَةُ الْوَجْهِ

بذل المعروف کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے کیساتھ اچھا اور خیر خواہی کا معاملہ کریں اور روپے، پیسے اور زبان سے اُسے جو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہوں، پہنچانے کی کوشش کریں۔ ہر آدمی یہ سوچے کہ وہ دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اور پھر جو کچھ ممکن آئے اور اس کا موقع بھی مل جائے تو وہ فائدہ پہنچائے۔

۲۔ کف الاذی کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے۔ اس بات کا خیال رکھے کہ میری کسی بات یا کسی فعل سے دوسرے کو ناحق اذیت، ناگواری اور

دل آزاری نہ ہو۔

۳۔ طلاقۃ الوجہ کے معنی ہیں خندہ پیشانی سے ملنا۔ مطلب یہ کہ جب آپ کسی سے ملیں تو آپ کے چہرے پر بشاشت ہو۔ دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ مجھ سے ملتے ہوئے خوش ہوا ہے۔ اس سے اس کے دل میں بھی خوشی پیدا ہوگی۔

یہ تین چیزیں حاصل ہیں حسن اخلاق کا۔

''بذل المعروف'' کی صورتیں:

بذل المعروف یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بہت سے طریقے ایسے بھی ہیں جن میں کوئی وقت، محنت اور پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا مثلاً آپ چلے جا رہے ہیں۔ راستہ میں کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں جس سے چلنے والوں کو تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ آپ نے چلتے چلتے اسے ہٹا دیا۔ اس پر کوئی وقت اور محنت خرچ نہیں ہوئی لیکن آپ نے اپنے اس عمل سے لوگوں کے ساتھ ایک حسن سلوک کر دیا۔

آپ بس میں بیٹھے ہیں، آپ کے پاس ایک ضعیف آدمی کھڑا ہے۔ بے چارہ تھک رہا ہے۔ آپ نے تھوڑا سا سرک کر اس کو جگہ دے دی تو آپ نے اس کے ساتھ حسن سلوک کر دیا۔

گھر میں گئے، دیکھا کہ کوئی ایسا مختصر سا کام ہے جس کے کرنے سے بیوی کو خوشی ہو سکتی ہے، وہ کر دیا تو یہ بھی بذل المعروف ہے۔ کسی بات سے بچے کو خوشی ہو سکتی ہے۔ وہ کر دی تو یہ بھی بذل المعروف ہے۔ بعض مرتبہ بچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے میں انہیں خوشی ہوتی ہے تو ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا بھی بذل المعروف میں شامل ہو جائے گا۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان دوڑ لگواتے تھے اور خود بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے کہ تم دوڑ لگا کر

اور دیکھیں کون سب سے پہلے آکر چھوتا ہے۔ بچے دوڑ لگاتے اور آپ کو چھونے کی کوشش کرتے۔ کوئی آپ کے پیٹ پر گرتا، کوئی رانوں پر گرتا، کوئی کہیں گرتا، کوئی کہیں گرتا۔ آپ بھی خوش ہوتے تھے اور بچے بھی خوش ہوتے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ جب اپنی خانقاہ سے گھر کی طرف تشریف لے جاتے تو بعض اوقات بچے کھیل رہے ہوتے تھے تو کبھی کسی بچے کے پیچھے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتے، تو وہ بچہ کہتا ''اللہ میاں! بڑے ابا مر جائیں''۔ بچے خوش بھی ہوتے اور بد دعا بھی کرتے۔ حضرت کو اس میں مزہ آتا تھا۔

بذل المعروف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مثلاً آپ کہیں بیٹھے ہیں اور دوسرا شخص آپ کے برابر میں آگیا۔ اگرچہ اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ کافی ہے لیکن آپ اس کے لئے تھوڑے سے سرک گئے تو اس کے دل میں خوشی پیدا ہوجائے گی کہ آپ نے اس کی قدر کی، اس کی اہمیت کا احساس کیا اور اس کی عزت کی۔ اور اگر سرکنے کی جگہ نہیں ہے تو روایات میں یہاں تک آتا ہے کہ تھوڑے سے ہل جائیں تاکہ اسے معلوم ہو کہ آپ نے اس کے آنے کو محسوس کیا۔ اس سے اس کے دل میں خوشی پیدا ہوجائے گی۔

غرضیکہ بذل المعروف (یعنی دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے) کے بے شمار طریقے ہو سکتے ہیں۔ گھر میں بھی ہو سکتے ہیں اور سفر میں بھی ہو سکتے ہیں۔ دفتر میں بھی ہو سکتے ہیں اور مسجد میں بھی ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر موقع کے لئے آدمی خود سوچ کر یہ کام کر سکتا ہے لیکن یہ کام جب ہوگا جب آدمی کو اس بات کا شوق ہوگا کہ وہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنا واقعہ سنا رہے تھے کہ ایک مرتبہ میں ہندوستان

میں سفر کر رہا تھا۔ انگریزی دور حکومت تھا، ریل کا سفر تھا۔ ریل میں رش بہت تھا اور سفر بھی رات بھر کا تھا۔ میرے برابر میں ایک بوڑھا ہندو بنیا آ کر بیٹھ گیا۔ دوران سفر اس کو نیند آ گئی تو میرے کندھے پر سر رکھ کر سو گیا۔ اب میرا مسئلہ یہ ہو گیا کہ اگر میں ذرا سا بھی ہلتا تو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سونے کے بعد خراٹے لینے لگا۔ اس کے منہ سے بدبو بھی آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ضعیف آدمی ہے اور میرا صاحب بالجنب (عارضی طور پر ساتھ ہونے والا ساتھی) ہے اور قرآن حکیم میں "صاحب بالجنب" کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس لئے میں بڑی احتیاط سے بیٹھا کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ کئی گھنٹے گذر گئے میں نے کروٹ نہیں بدلی۔ وہ خوب سویا، کسی شہر میں گاڑی رکی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ چونکہ میں کئی گھنٹے کا جاگا ہوا تھا اس لئے میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اونگھ آئی تو میرا سر اس کے کندھے سے ہلکا سا ٹکرایا اس نے فوراً مجھے دھکا دیا۔

اس نے ایک منٹ کے لئے بھی اس کو گوارا نہ کیا کہ کسی مسلمان کو ایک منٹ کے لئے راحت مل جائے جب کہ انہوں نے گھنٹوں تکلیف برداشت کر کے اسے راحت پہنچائی۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعے سے بھی یہ بات معلوم ہوئی اور قرآنی آیات اور احادیث سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسن سلوک کا تعلق صرف مسلمان ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کافروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا اور اس کو تکلیف سے بچانا اس کا حق ہے۔

"کف الاذی" کی تفصیل:

"کف الاذی" کا حاصل یہ ہے کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ کسی دوسرے کو آپ کی وجہ سے ذرہ تکلیف نہ ہو۔ بعض لوگوں کی عادت شریعت پہنچے کی

ہوتی ہے، ایسے لوگ بعض مرتبہ دوران سفر بھی سگریٹ پیتے رہتے ہیں اور برابر والوں پر دھواں چھوڑتے رہتے ہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے، یہ جائز نہیں۔

بعض پان والے پان کھاتے ہیں اور قریب ہی اس کی پیک تھوکتے رہتے ہیں۔ دوسرے کو اس سے گھن آتی ہے۔ یہ بھی تکلیف دینے والی چیز ہے۔ بعض نسوار کھانے والے بیچ بیچ تھوکتے رہتے ہیں حالانکہ برابر میں دوسرے افراد موجود ہوتے ہیں۔ اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

بعض لوگ ریل میں پہلے سے پہنچ جاتے ہیں حالانکہ ان کی ریزرویشن (Reservat on) نہیں ہوتی۔ کپڑا بچھا کر جگہ پر قبضہ کر لیا۔ بعض مرتبہ کوئی شخص صرف ایک ٹکٹ لیتا ہے لیکن دو آدمیوں کی جگہ پر قبضہ کر بیٹھتا۔ یہ صرف حسن اخلاق کی بات نہیں بلکہ یہ تو حق کی ادائیگی اور گناہوں سے بچنے کی بات ہے۔ جتنے کا ٹکٹ تم نے لیا ہے، اتنے کا دوسروں نے بھی لیا ہے۔ تمہیں بھی ایک آدمی کی جگہ ٹھہرنے کا حق ہے، دوسرے کو بھی اتنی ہی جگہ ٹھہرنے کا حق ہے۔ تم نے دو آدمیوں کی جگہ پر قبضہ کر کے دوسرے کا حق مار لیا۔ اسی طرح ایسے طریقے سے بیٹھنا کہ جس سے برابر والے کو تنگی ہو رہی ہو جائز نہیں۔

اسی طرح اگر کسی کے منہ میں بدبو ہو تو اس کے لئے مسجد میں جانا کہ جس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف ہو، جائز نہیں۔ حدیث میں ہے کہ "جس شخص نے کچی پیاز کھائی ہو یا کچا لہسن کھایا ہو تو وہ مسجد میں نہ آئے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچے پیاز اور لہسن کے کھانے سے منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے جس سے برابر والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور مسجد میں فرشتے بھی ہوتے ہیں، انہیں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے منع کیا گیا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ لہسن اور پیاز سے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تکلیف تو سگریٹ و بیڑی سے ہوتی ہے اور اس سے زیادہ تکلیف بدبو منہ کی ہوتی

ہے اگر کسی کے منہ میں پائیوریا کی بیماری ہے۔ اور ایسی ہی تکلیف بغلوں سے ہوتی ہے اگر کسی کی بغلیں صاف نہ رہتی ہوں، سخت گرمی کے موسم میں چھینٹوں کے باوجود نہاتے نہ ہوں۔ اس سے کپڑوں میں پسینے کی بو آجاتی ہے جس سے برابر والوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

''ادب'' کی جامع تعریف:

ہم ایک مرتبہ اپنے مرشد حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اہل مجلس سے ایک سوال کیا۔ فرمایا کہ یہ بات بہت کی جاتی ہے کہ فلاں کام ادب کے موافق ہے اور فلاں بات ادب کے خلاف ہے۔ ادب کس کو کہتے ہیں؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ مجلس میں علماء کرام موجود تھے اور علماء ہی سے یہ خطاب تھا۔ آپ کے اس سوال پر ہم سب خاموش رہے۔ پھر خود ہی فرمایا کہ بعض لوگ ادب اسے سمجھتے ہیں کہ آہستہ آواز میں بات کرے، اونچی آواز میں نہ بولے۔ بعض لوگ ادب یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے کے آگے سر جھکا کے بیٹھے، ان کی طرف نہ دیکھے۔ بعض حضرات ادب یہ قرار دیتے ہیں کہ چھوٹے بڑوں کے پیچھے چلے، آگے نہ چلے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی ادب کی جامع اور مکمل تعریف نہیں ہے۔ ادب کی صحیح تعریف یہ ہے کہ ''آپ دوسروں کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کریں جس سے دوسرے کو ناحق کوئی تکلیف یا ناگواری ہو''۔

جو باتیں اوپر ذکر کی گئی ہیں کبھی ان کا کرنا ادب ہوتا ہے اور کبھی ان کے برعکس معاملے میں ادب پایا جاتا ہے۔ مثلاً رات کا وقت ہے اور راستہ خراب اور پرخطر ہے اور اندھیرا بھی ہے اور آپ کسی بڑے کے ساتھ چل رہے ہیں تو وہاں ادب کا تقاضا یہ ہے کہ آپ خود آگے ہو جائیں اور بزرگ کو پیچھے رکھیں تاکہ راستہ دیکھیں،

کوئی دشمن ہے تو اس سے بچانے کا اتفاق ہو گیا، جھاڑ جھنکار ہیں تو ان کو راستے سے ہٹائیں وغیرہ وغیرہ غرضیکہ یہاں ادب کا تقاضا پیچھے چلنا نہیں، آگے چلنا ہے۔ اسی طرح بعض مرتبہ آہستہ کے بجائے بلند آواز سے بولنا ادب ہوتا ہے۔ اگر آپ اتنا آہستہ بولیں کہ بڑے تک آواز ہی نہ پہنچے تو یہ ادب کے خلاف ہے، وہاں اونچی آواز سے بولنا چاہیے کہ بڑا آپ کی آواز بآسانی سن سکے۔ اسی طریقے سے کبھی گردن جھکا کر بیٹھنا ادب ہوتا ہے لیکن کبھی بڑے کی طرف دیکھنا ادب کی بات ہوتی ہے مثلاً اگر وہ آپ سے بات کر رہے ہیں، اور آپ گردن جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں تو اس سے ان کو الجھن ہوگی کہ پتہ نہیں میں پتھر سے بات کر رہا ہوں یا انسان سے کلام کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ میری بات سن بھی رہا ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں ادب کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کی طرف دیکھیں۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قول و فعل سے دوسروں کو ناحق طور پر ادنیٰ ناگواری اور تکلیف سے بچانا ادب ہے اور "کف الاذیٰ" کا حاصل بھی یہی ہے کہ آپ کی وجہ سے کسی کو ادنیٰ ناحق تکلیف یا ناگواری نہ ہو۔

تبسم ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت:

تیسری چیز ہے "طلاقۃ الوجہ" (یعنی خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ عام طور پر آپ کے چہرۂ انور پر تبسم رہتا تھا۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ جب بھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، آپ نے تبسم کے ساتھ ملاقات فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر تشریف لے جاتے تو آپ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت ہوتی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ ہاں اگر آپ کبھی کوئی

ناجائز بات دیکھتے تو آپ کے چہرۂ انور پر اس سے ناگواری کے آثار ظاہر ہوتے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے تشریف لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دروازے پر پردہ ڈال رکھا تھا اور اس پر کوئی تصویر تھی (اس وقت تک تصویر کی حرمت کے متعلق احکام آئے ہی نہیں تھے یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو علم نہ ہوا تھا) آپ فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب آپ تشریف لائے تو آپ کا چہرہ ناگواری کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ میں نے عرض کیا۔ میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے معافی پہلے مانگی۔ غلطی بعد میں پوچھی۔ یہ ادب کی بات ہے) آپ نے یہ سن کر تصویر کے متعلق مسئلہ بتلا دیا۔ یہ خاص حالت کا بیان ہے ورنہ عام حالات میں آپ کے چہرے مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔

ایمان کے اعتبار سے اتنا ہی کامل

تو حسن خلق کا خلاصہ تین چیزیں ہوئیں۔ دوسرے کو فائدہ پہنچانا، ذہنی تکلیف سے بچانا اور مسکرا کر ملنا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ان میں سے زیادہ اچھے اخلاق والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے اندر یہ تینوں باتیں جتنی زیادہ ہوں گی وہ ایمان کے اعتبار سے اتنا ہی کامل ہوگا۔ اس سے حسن اخلاق کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسکرانے کی عادت ڈالیں

دوستو بزرگو! [illegible] عادت ڈالنے [illegible]

کرنے سے کام چلتا ہے۔ ان اعمال کو اپنے اندر پیدا کرنے کی مشق کی جائے بعض لوگوں کے چہروں پر کسی وجہ سے مسکراہٹ نہیں ہوتی مثلاً بچپن سے عادت نہیں پڑی، یا کسی تکلیف و بیماری میں مبتلا رہتے ہیں یا کسی کو غم و پریشانی ہوتی ہے جس کو سوچتے رہنے کی وجہ سے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آتی۔ یہ شخص سوچا کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی کتنی پریشانیاں اور سختیاں آتی تھیں۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ دشمنوں نے کیسے کیسے منصوبے بنائے اور کتنا کتنا ستایا لیکن سب کچھ کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی بشاشت معروف ہے۔ یہ تصور کرنے سے چہرے پر مسکراہٹ آنا شروع ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ بات کرتے ہوئے یہ عادت ڈالیں کہ جب کسی سے بات کیا کریں تو مسکرا کر کیا کریں۔ شروع میں بتکلف ایسا کرنا ہوگا۔ رفتہ رفتہ اس کی عادت پڑ جائے گی۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت:

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ:

خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَاءِ ہِمْ

”تم میں سے سب سے اچھے مرد وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ سب سے زیادہ اچھے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیویوں سے حسن سلوک اور اس کا اثر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ نکاح فرمائے۔ ایک وقت میں سات خواتین بھی جمع ہوئیں۔ آپ نے ان کے حقوق والے ادا ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ یہ سب خواتین آپ پر فریفتہ تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی شان میں

یہ شعر پڑھا کرتی تھیں۔

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْ رَءَیْنَ جَبِیْنَہٗ
لَآثَرْنَ بِقَطْعِ الْقُلُوْبِ عَلَی الْیَدِ

ترجمہ: زلیخا کو ملامت کرنے والی عورتیں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کو دیکھ لیتیں تو انگلیوں کو کاٹنے کے بجائے اپنے دلوں کو چیر ڈالتیں۔

زلیخا کا واقعہ مشہور ہے۔ قرآن حکیم میں بیان کیا گیا ہے۔[1] حضرت یوسف علیہ السلام سے اُسے عشق کے درجے میں محبت ہوگئی تھی۔ عورتوں نے ملامت کی اور کہا کہ اسے کیا ہوگیا ہے کہ یہ فلاں سے محبت کرنے لگی۔ زلیخا کو جب پتہ چلا تو اس نے ایک مجلس منعقد کی، ان خواتین کی دعوت کی۔ ان کے سامنے پھل رکھ دیئے اور ان کے ہاتھوں میں چاقو دے دیئے تاکہ وہ انہیں کاٹ کاٹ کر کھائیں۔ یوسف علیہ السلام گھر میں کہیں تھے۔ انہیں آواز دی۔ جب آپ سامنے آئے تو عورتیں آپ کے حسن و جمال سے ایسی مبہوت ہوئیں کہ انہیں اپنا ہوش ہی نہ رہا اور پھلوں کے بجائے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسے اشعار ارشاد فرما رہی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر سے بے پناہ قلبی تعلق تھا۔ یہی حال تمام ازواج مطہرات کا تھا۔ تو آپ نے کر کے دکھایا کہ ایک کامیاب اور عظیم شوہر اپنی بیویوں کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کرنے والا ہوتا ہے۔

1 سورۃ یوسف، ۲۹۔۳۲

یہ دونوں باتیں بتلائیں کہ حضرت نے مجھے کبھی کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں دیا۔ میں اپنی خوشی سے ان کی خدمت کیا کرتی تھی اور حضرت نے زندگی بھر مجھ سے لہجہ بدل کر بات نہیں کی۔

بیٹیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی فضیلت:

اور یہاں یہ بات جاننا بھی ضروری ہے کہ عورتوں میں جہاں بیویاں ہیں، اسی طرح بیٹیاں بھی شامل ہیں۔ بیٹیوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔

عرب میں ایک بڑا برا اور ظالمانہ رواج تھا کہ لڑکی کے پیدا ہونے پر ناخوش ہوتے، ناک بھوں چڑھاتے، اپنے لئے لڑکی کو عار سمجھتے اور اُسے زندہ دفناتے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اسلام نے اس ظالمانہ اور بہیمانہ رسم کا خاتمہ کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی فضیلت بیان کی جن کی بیٹیاں ہوتیں اور وہ ان کو پالتے اور آپ نے اپنی شہادت والی اور اس کے ساتھ والی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ:

> "میں اور دو بیٹیوں کی پرورش کرنے والے جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے۔[1]"

ماں کا مقام:

اسی طریقے سے خواتین میں مائیں بھی داخل ہیں۔ ماں کا یہ مرتبہ رکھا گیا کہ اللہ رب العالمین کے بعد والدین کا حق ہے، اس میں ماں شامل ہے اور ویسے بھی باپ کے مقابلے میں ماں کا حق زیادہ ہے۔ اور جرائم میں شرک کے بعد سب سے بڑا

[1] اس حدیث کی عربی عبارت یہ ہے: "من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیمة انا و هو هکذا" و ضم اصابعه (رواه مسلم بحواله مشکوٰة المصابیح، کتاب الآداب، باب الشفقة و الرحمة علی الخلق، الفصل الأول)

جرم والدین کے ساتھ بدسلوکی کا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔

اسلام نے عورت کو بہت بلند مقام دیا ہے:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو کس قدر مقام عطا کیا ہے اور اس کا کس قدر احترام رکھا ہے۔ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی کس قدر تاکید کی ہے۔

اسلام نے صلہ رحمی کو فرض قرار دیا۔ جس طرح نماز فرض ہے اسی طرح اپنے اپنے درجے میں صلہ رحمی بھی فرض ہے۔ صلہ رحمی کے مستحق رشتہ داروں میں جس طرح مرد شامل ہیں، عورتیں بھی اسی طرح شامل ہیں۔ لہٰذا جس طرح مرد رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے، عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ بھی ضروری ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں حسن اخلاق کے تقاضوں پر عمل کرنے اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ○

رشتہ داروں کو صدقہ دینے کے فضائل
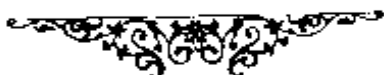
﴿رشتہ داروں کو صدقہ دینے کے فضائل﴾

خطبہء مسنونہ:

نحمدہٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم،

اما بعد!

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیْ، وَلٰکِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُہٗ وَصَلَہَا" (رواہ البخاری باب لیس الواصل بالمکافی، رقم الحدیث ۵۹۹۱، فی جامع الترمذی رقم الحدیث ۱۹۰۸)

واصل اور مکافی کے معنی:

اس حدیث میں دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ واصل اور مکافی۔ واصل کے معنی ہیں صلہ رحمی کرنے والا، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا اور مکافی کا مطلب ہے برابر سرابر کا معاملہ کرنے والا، معاملے کو برابر کر دینے والا۔ فرض

وہ بیمار پڑ جائیں تو یہ نہ سوچے کہ جب ہم بیمار ہوئے تھے، ہمارا آپریشن ہوا تھا تو وہ بھی ہمیں پوچھنے نہیں آئے ہم کیوں جائیں، بلکہ ان کی عیادت کرنے کے لئے چلا جائے۔ ورنہ اسے صلہ رحمی کے فضائل حاصل نہ ہوں گے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ عیادت سنت کے مطابق کریں، اس کے آداب کا خیال کریں مثلاً بے وقت نہ جائیں، زیادہ دیر نہ بیٹھیں، کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے مریض یا تیمارداروں کو تکلیف ہو وغیرہ۔

"باندی آزاد کرنے کے بجائے رشتہ داروں کو دیتی تو زیادہ ثواب ملتا"

ایک حدیث میں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے پاس ایک باندی تھی جسے انہوں نے آزاد کیا۔ (پرانے زمانے میں غلام اور باندیاں ہوتی تھیں اور ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی) اس دور میں غلام اور باندی بہت بڑا مال تصور کیا جاتا تھا۔ جس طرح کسی کے پاس اونٹ ہوتا اس کے مالدار ہونے کی علامت تھی، اسی طرح غلام اور باندی رکھنے والا شخص بھی مالدار سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت میمونہ نے ثواب حاصل کرنے کے لئے باندی کو آزاد کیا تھا (اور شریعت میں غلام اور باندی کو آزاد کرنے کے متعدد فضائل بیان کئے گئے ہیں) صحابہ کرام میں یہ عام معمول تھا کہ غلام خرید کر اسے آزاد کر دیتے تھے۔

حضرت میمونہؓ نے باندی کو آزاد کرنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ نہیں کیا تھا، اجازت بھی نہیں مانگی تھی چونکہ خود مالکہ تھیں، اس لئے انہیں ایسا کرنے کا اختیار تھا۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے باندی کو آزاد کر دیا ہے۔ آپ نے سوالیہ انداز میں پوچھا: آزاد کر دیا؟ عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: اگر تو یہ باندی آزاد کرنے کے بجائے اپنے ننھیال کے رشتہ

داروں کو دے دیتی تو اور زیادہ اجر و ثواب ملتا۔ (بخاری و مسلم)

حدیث میں "اخوال" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اخوال "خال" کی جمع ہے۔ ماموں کو کہتے ہیں۔ اس سے ننھیال کے رشتہ دار مراد ہیں۔ یہاں پر بظاہر "اخوال" کے لفظ کا مقصود یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ددھیال یا چچا، تایا وغیرہ کو دینے کی یہ فضیلت نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ننھیال کے رشتے دار کچھ زیادہ ضرورت مند ہوں گے کہ ان کو دینے میں صدقے کا بھی ثواب ملتا اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی بھی ہو جاتی۔ ورنہ دوسرے رشتے داروں کو ہبہ کے طور پر کچھ دینا بھی بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ غلام یا باندی آزاد کرنے کے بارے میں ایک فضیلت یہ آئی ہے کہ اس کے بدلے آزاد کرنے والا جہنم سے آزاد ہو جاتا ہے لیکن اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ اسے آزاد کرنے کے بجائے رشتہ داروں کو ہبہ کے طور پر دینا اس سے بھی زیادہ فضیلت والا عمل ہے۔

رشتہ داروں کو دینا ایک حد تک فرض بھی ہے:

اس غلط فہمی میں بھی بہت سے لوگ مبتلا ہیں کہ وہ دیگر مصارف میں صدقہ دینے کو ثواب کا کام سمجھتے ہیں لیکن رشتہ داروں کو کچھ دینا ان کے خیال میں دنیا کا کام ہے۔ مسجد پر بھی لگائیں گے، پانی کی ٹنکی بنوا دیں گے، کوئی کنواں کھد رہا ہے، اس میں بھی حصہ ڈال دیں گے، مدرسہ کو چندہ بھی دے دیں گے۔ فقیروں کی بھی مدد بھی کر دیں گے لیکن رشتہ داروں کے بارے میں بڑے کنجوس ہوں گے۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ صدقہ کریں گے تو ثواب ملے گا، رشتے داروں کو دیں گے تو ثواب نہیں ملے گا۔

یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ رشتے داروں کو دینے میں دگنا اجر ہے۔ صدقے کا بھی ثواب ہے اور صلہ رحمی کا بھی ثواب ہے بلکہ ایک حد تک فرض بھی ہے۔

کافر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور مالی تعاون کرنا چاہئے؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا مسلمان تھیں اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئی تھیں لیکن ان کی والدہ نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کی کئی شقیں تھیں۔ ان میں ایک اہم بات یہ طے ہوئی کہ آئندہ دس سال تک دونوں فریقوں کے درمیان جنگ نہیں ہوگی۔ اس معاہدہ کی وجہ سے امن و امان قائم ہو گیا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے لوگ ایک دوسرے کے پاس آنے جانے لگے۔ رشتہ دار ایک دوسرے کو ملنے لگے۔ مکہ مکرمہ کے جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے تھے، ان کے بھی بہت سے رشتہ دار مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ باپ کافر ہے تو وہ وہیں رہ گیا، بیٹا مدینہ طیبہ آگیا جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ آگئے اور ان کے والد ابو قحافہ (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) مکہ میں رہ گئے۔ بھائی بھائی سے جدا ہوا جیسے عمر فاروق مدینہ طیبہ آگئے ان کے بھائی مکہ میں رہے۔ ماں بیٹی سے الگ ہوگئی۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تو ہجرت کر چکی تھیں لیکن آپ کی والدہ کافرہ تھیں (بعد میں مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ آئی تھیں) اس وقت تک مسلمان نہ ہوئی تھیں۔

صلح حدیبیہ کی وجہ سے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ رشتہ دار بھی آنے جانے لگے۔ حضرت اسماء کی والدہ بھی آپ سے ملنے کے لئے آگئیں۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ تو کافرہ ہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک کروں یا نہ کروں؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری والدہ میرے پاس آئی ہے اور یہ امید لے کر آئی ہے کہ

میں اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کروں (یعنی ان کی کچھ مالی معاونت کروں) تو کیا میں والدہ کے ساتھ احسان کا سلوک کر سکتی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا

نَعَمْ، صِلِي أُمَّكِ (صحیح مسلم، کتاب [illegible])

"ہاں، اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ماں باپ اگر کافر و مشرک بھی ہوں تو بھی ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا نہ چھوڑا جائے۔ ان کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ ہو۔ ضرورت ہو تو مالی تعاون بھی کیا جائے ان کی خدمت کی جائے البتہ ان کی زیادہ تعریف نہ کرو کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ آپ ان کے مذہب اور عقیدے کو بھی پسند کرتے ہیں۔

فاسق ماں باپ کا حکم

جب کافر اور مشرک ماں باپ کا یہ حکم ہے تو اگر کسی کے ماں باپ فاسق و فاجر ہوں یعنی کسی بڑے کبیرہ گناہ میں مبتلا ہوں جیسے شراب پیتے ہوں، سود کھاتے ہیں، رشوت لیتے ہوں یا جھوٹ اور دغا بازی کے جرم میں مبتلا ہوں وغیرہ تو ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ ہم سے ایسے نوجوان ملتے ہیں جو اپنے والدین کے بارے میں ایسی شکایات لے کر آتے ہیں۔ ہم ان سے یہی کہتے ہیں کہ نرمی اور ادب و احترام کے ساتھ ایک دو مرتبہ انہیں سمجھا دو، مسئلہ معلوم نہیں تو مسئلہ بتا دو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ ان سے لڑائی جھگڑا کرو نہ ان سے نفرت ظاہر کرو۔ بلکہ جس خدمت کی ضرورت ہو تو ان کی خدمت بھی کرو۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا خاص وصف:

اگلی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں اور ان کا خاص وصف یہ ہے کہ یہ فقہا صحابہ میں شمار ہوتے ہیں یعنی ان صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے جو فقہ کے اندر سب سے زیادہ ماہر تھے۔ شریعت کے احکام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کا آنا جانا کثرت سے ہوتا تھا کہ بعض دیکھنے والے یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ بھی گھر ہی کے کوئی آدمی ہیں۔

خواب میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زیارت کا واقعہ:

بات یاد آگئی۔ اس سے پہلے کبھی میں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میرے مرشد حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمہ اللہ کی زندگی کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ میں نے خواب میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زیارت کی۔ لمبا خواب تھا۔ میں نے حضرت عارفی صاحب رحمہ اللہ کو تنہائی میں وہ خواب سنایا۔ حضرت نے اس کی تعبیر بتائی جو میرے لئے بشارت تھی۔ فرمایا کہ ان شاء اللہ تمہیں تفقہ فی الدین حاصل ہوگا، فقہ میں ترقی ہوگی۔ (اللھم اجعلنا کذلک) اس سے پہلے اس واقعہ کو بیان کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ آج اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ لوگ دعا کریں کہ میرے مرشد حضرت عارفی صاحب رحمہ اللہ نے جو تعبیر بتائی، اللہ تعالیٰ اسے پورا کردے۔

عورتوں کو صدقہ دینے کا حکم:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین سے خطاب کیا اور اس میں یہ فرمایا

«تصدقن یا معشر النساء ولو من حلیکن»

"اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ خیرات کرو، اگرچہ زیور ہی دینا پڑے۔"

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر گھر اپنے شوہر کے پاس آئی اور ان سے کہا: تمہارے پاس پیسے کی کمی ہے۔ تم غریب آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر پوچھو کہ کیا میں تمہیں صدقہ دے سکتی ہوں۔ اگر تجھے صدقہ دینے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا پورا ہو جاتا ہے تو بہت بہتر ورنہ میں یہ صدقہ کسی اور کو دے دوں گی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تم ہی چلی جاؤ اور یہ بات خود پوچھ لو"۔

شوہر کو صدقہ دینے کی فضیلت:

فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پوچھنے کے لئے چلی۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک انصاری عورت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر موجود تھی اور اس کا مسئلہ بھی وہی تھا جو میرا مسئلہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب اور جلالت شان کی وجہ سے مجھے خود بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں بلال حبشی رضی اللہ عنہ آ نکلے۔ ہم نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بتاؤ کہ دو عورتیں دروازے پر موجود ہیں اور آپ سے یہ پوچھتی ہیں کہ اگر وہ اپنا صدقے کا مال اپنے شوہروں کو دے دیں یا ان یتیموں کو دے دیں جو ان کے پاس زیر کفالت ہیں (یتیموں سے مراد پہلے شوہر سے ہونے والی اولاد ہے) تو اس سے صدقہ کرنے کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ اس سوال کے

ساتھ حضرت بلال سے یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہ بتانا کہ ہم کون ہیں؟

حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور یہ پیغام پہنچا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

﴿مَنْ هُمَا﴾

"وہ دو عورتیں کون ہیں؟"

عورتوں نے اپنے بارے میں بتانے سے منع کیا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ اب ایک طرف عورتوں کا کہنا کہ مت بتانا اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کہ بتاؤ وہ کون ہیں؟۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے فوراً بتایا اور کہا کہ ایک انصاری خاتون ہے اور ایک زینب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے خلاف مزید پوچھا کہ

﴿فَأَيُّ الزَّيَانِبِ هِيَ﴾

"یہ کونسی زینب ہے؟"

مطلب یہ کہ زینب نام کی بہت سی عورتیں ہیں۔ یہ کونسی زینب ہے جو مسئلہ پوچھنے آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت شریفہ یہ تھی کہ وہ عورتوں کے نام پوچھیں البتہ اگر کہیں مسئلے کی وضاحت کے لئے ضرورت ہوتی تو نام بھی پوچھا جاتا تھا۔ یہاں پر ایسی ضرورت پیش آگئی۔ زینب نام کی متعدد خواتین تھیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں کہ ان کے شوہر مالدار تھے۔ اور بعض ایسی تھیں کہ ان کے شوہر غریب تھے اور مسئلہ صدقے کا پوچھا جا رہا تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ سائلہ کا علم ہوتا کہ پتہ چلے کہ ان کا شوہر کونسا ہے اور صحیح مسئلہ بتایا جا سکے۔

بلال رضی اللہ عنہ نے اس سوال کے جواب میں عرض کیا

﴿امرأة عبد الله﴾

"عبداللہ بن مسعود کی بیوی ہیں۔"

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ اپنے شوہر کو صدقہ دیں گی تو ان کو دہرا اجر ملے گا۔ ایک رشتہ داری کا ثواب اور دوسرا صدقہ کرنے کا ثواب۔ (بخاری و مسلم)

یہاں پر نفلی صدقہ مراد ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ خیرات میں رشتہ داروں کا حق بہت مقدم ہے اور رشتہ داروں کو صدقہ دینے میں دوسرے کے مقابلے میں دگنا ثواب ہے۔ البتہ یہاں ایک اہم مسئلہ سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ صدقے کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ واجب صدقہ جیسے زکوۃ، صدقۃ الفطر، قربانی کی کھال کی قیمت، رمضان کے روزوں کا فدیہ، کفارہ کی رقم وغیرہ۔

۲۔ نفلی صدقہ۔

پہلی قسم کے صدقہ دینے میں یہ تفصیل ہے کہ باپ بیٹے کو نہیں دے سکتا۔ بیٹا باپ کو نہیں دے سکتا اسی طرح کوئی شخص اپنے دادا، دادی، نانا، نانی، پڑدادا، پڑدادی، پڑنانا، پڑنانی، پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی کو نہیں دے سکتا۔ خلاصہ یہ کہ یہ جس کی اولاد میں سے ہے یا جو اس کی اولاد میں ہے انہیں صدقہ واجب نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح بیوی شوہر کو اور شوہر بیوی کو صدقہ واجب نہیں دے سکتا۔ البتہ نفلی صدقہ ہر ایک کو دیا جا سکتا ہے۔ ان رشتے داروں کو بھی دیا جا سکتا ہے جن کو صدقہ واجب دینا جائز نہیں حتی کہ کافر کو بھی دیا جا سکتا ہے اور میاں بیوی ایک دوسرے کو بھی دے سکتے ہیں۔ بظاہر یہاں پر بھی نفلی صدقہ ہی مراد ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا طرزِ عمل:

الحمدللہ، ہم نے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل دیکھا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کی دو بہنیں بیوہ تھیں اور دونوں بہنوں کی کافی کافی اولاد تھی۔ ان بہنوں اور ان کی اولاد کی کفالت والد صاحب رحمہ اللہ کیا کرتے تھے۔ والدہ (یعنی ہماری دادی) بھی بیوہ تھیں، ان کی کفالت بھی انہی کے ذمہ تھی اور ہم ماشاء اللہ نو بہن بھائی تھے۔ والد اور والدہ ملا کر گیارہ آدمی گھر کے تھے۔ بارھویں دادی جان تھیں۔ دو بہنوں اور ان کی اولاد کی کفالت کا مسئلہ بھی تھا۔ تنخواہ کیا تھی؟ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کے آخری زمانے میں ساٹھ روپے تنخواہ تھی۔

حضرتؒ رشتہ داروں کا خیال کس کس طرح کرتے تھے؟

مجھے یاد ہے کہ والد صاحب جب جمعہ کی نماز کے لئے جاتے تھے تو نماز سے فارغ ہو کر پھل لیتے اور اس بہن کے گھر جاتے جو دیوبند میں رہتی تھی (دوسری بہن کسی اور شہر میں رہتی تھی) اور ان کے ہاں پھل دے دیا کرتے تاکہ یتیم بچوں کو موسم کے پھلوں کی کمی محسوس نہ ہو اور دوسری بہن کے ہاں مختلف اوقات میں رقم بھجواتے رہتے۔ پاکستان آنے کے بعد بھی ان کا یہ معمول جاری رہا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں رہائش پذیر اپنے ننھیال، ماموں زاد بھائی اور خالہ زاد بھائی بہنوں کا ایسا خیال رکھتے کہ ان کو یہاں سے ماہانہ خرچ بھیجتے تھے۔ اور جب قانونی طور پر یہاں سے روپیہ بھیجنے پر پابندی لگ گئی تو دوسرے ملکوں کے ذریعے بھیجتے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کا گھر گر چکا ہے اور ان کے بارے میں اندیشہ بھی تھا کہ اگر انہیں مرمت کے لئے نقد رقم دی جائے گی تو وہ کھا پی کر

ختم کر دیں گے تو کسی صورت میں کسی اور رشتے دار کو قطع تعلقی کر کے ان کے ظرح حرمت کر لو۔

رشتے داروں کے زبردست حقوق ہیں:

یہ سب کچھ شریعت کا حکم ہے۔ رشتے داروں کا معاملہ معمولی نہیں، رشتے داروں کے زبردست حقوق ہیں اور ان کی ادائیگی کا اجر و ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن افسوس کہ آج کل اس طرف دھیان بہت کم دیا جاتا ہے۔ جہاد، تبلیغ، علم دین، حج اور عمرے وغیرہ کے فضائل خوب سننے کو ملتے ہیں لیکن صلہ رحمی اور رشتے داروں کے حقوق کا بیان شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت غفلت پائی جاتی ہے۔

دیندار کون؟

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص بہت بڑا عبادت گذار ہے، تہجد کا اہتمام کرتا ہے، نفلی حج و عمرے کرتا ہے، تلاوت بہت کرتا ہے۔ یہ سب بڑے اجر و ثواب کے کام ہیں لیکن اگر وہ رشتے داروں کے حقوق ادا نہیں کرتا تو آپ اسے عبادت گذار تو کہہ سکتے ہیں۔ دیندار نہیں کہہ سکتے۔ عبادت دین کا ایک حصہ ہے، سارا دین عبادت میں منحصر نہیں۔ دین کے پانچ بڑے بڑے شعبے ہیں۔

۱۔ عقائد

۲۔ عبادات جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ

۳۔ معاملات جیسے خرید و فروخت، تجارت، معیشت، ملازمت، مزدوری، زراعت اور کاشتکاری وغیرہ وغیرہ

۴۔ معاشرت: ایک دوسرے کے ساتھ میل جول کرنے کے احکام سے متعلق۔

۵۔ باطنی اخلاق یعنی دل کی اصلاح کے متعلق ہے کہ اس میں تکبر نہ ہو، تواضع ہو، حسد نہ ہو، لالچ اور طمع نہ ہو، قناعت ہو، اللہ سے بے خوفی اور بے فکری نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، اس کی محبت ہو۔ یہ باطنی حصہ ختم ہو گیا ہے۔

جو شخص ان پانچ حصوں پر عمل کرے گا، اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ دیندار ہے، شریعت پر عمل کرنے والا ہے، اللہ والا ہے، نیک انسان ہے۔ لیکن اگر کسی ایک شعبے کو چھوڑ رکھا ہے تو اسے دیندار نہیں کہا جائے گا، اسے اللہ والا اور ولی اللہ نہیں کہا جائے گا۔

صدقہ بھی، صلہ رحمی بھی:

ایک حدیث میں ہے:

﴿اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَعَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ، صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ﴾ (ترمذی، رقم الحدیث ۶۵۸)

"اگر کسی غریب اور مسکین آدمی کو صدقہ دیا تو صرف صدقے کا ثواب ملے گا لیکن اگر رشتہ دار کو صدقہ دیا جائے تو صدقے کا ثواب بھی ملے گا اور صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا۔"

لہٰذا اگر کسی کے رشتہ دار صدقے کے مستحق ہوں تو ان کو چاہئے کہ دوسرے فقیروں کے مقابلے میں ان کو مقدم رکھے کیونکہ اس میں زیادہ اجر و ثواب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

والدین اور رشتہ داروں سے بدسلوکی
ایک ہولناک گناہ

والدین اور رشتہ داروں سے
بدسلوکی ایک ہولناک گناہ

خطبۂ مسنونہ:

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم

اما بعد!

قال اللہ تبارک و تعالٰی: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ عن عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ عن ابیہ قال کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال الا انبئکم باکبر الکبائر ثلاثا الاشراک باللہ و عقوق الوالدین و شہادۃ الزور او قول الزور و کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متکئا فجلس فمازال یکررھا حتٰی قلنا لیتہ سکت۔ (ترمذی، [illegible])

تمہید

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز!

اس سے پہلے ان آیات و احادیث کی مختصر تشریح کی گئی تھی جن میں والدین اور رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی کے فضائل بیان کیے گئے۔ آج کی مجلس میں نیا باب شروع ہو رہا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ اس کے برخلاف کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے بجائے بدسلوکی کرنے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کے بجائے قطع رحمی کرنے کی کیا وعیدیں اور کیا کیا نقصانات ہیں۔

اس بارے میں سب سے پہلے یہ آیت شریفہ ہے:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ. أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ.﴾ (سورۃ محمد: ۲۲، ۲۳)

ترجمہ: ''تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو ملک میں خرابی کرنے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان (کے کانوں) کو بہرا اور (ان کی) آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی لعنت:

اس میں انسانوں سے خطاب کر کے یہ کہا گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے روگردانی کرو زمین میں فساد پھیلاؤ اور قطع رحمی کرو، رشتے داروں کے تعلقات کو جوڑنے کے بجائے انہیں توڑو ان کے

ساتھ حسن سلوک کے بجائے بدسلوکی کرو تو سن لو! یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت بھیجی ہے اور انکو بہرا اور اندھا کر دیا۔ بہرا اور اندھا کرنے کا مطلب ہے کہ حق بات کو سننے سے بہرا کر دیا اور حق بات کو دیکھنے سے اندھا کر دیا۔ اب انہیں حق سنائی نہیں دیتا اور حق دکھائی نہیں دیتا۔ سنائی نہ دینے اور دکھائی نہ دینے سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ ظاہری کانوں سے حق سنتے بھی ہوں اور ظاہری آنکھوں سے دیکھتے بھی ہوں لیکن چونکہ وہ سننے اور دیکھنے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ اس لئے یہ دیکھنا اور سننا نہ دیکھنے اور نہ سننے کے برابر ہو گیا تو گویا یہ ایسے ہی ہو گئے جیسے یہ اندھے بہرے ہیں۔

دیکھئے! اس میں رشتے داروں کے حقوق ادا نہ کرنے اور زمین میں فساد کرنیوالوں پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ ایک اور آیت میں بھی اس عمل پر لعنت کا ذکر ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ ۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (الرعد: ۲۵)

"اور جو لوگ خدا سے عہد واثق کر کے توڑ ڈالتے ہیں اور جن (رشتہ ہائے قرابت) کے جوڑے رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے ان کو قطع کر دیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہیں۔ ایسوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔"

"یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل" کا مطلب ہے کہ صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی کرتے ہیں۔ جن تعلقات کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا تھا انہیں توڑتے ہیں۔

لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ○ (بنی اسرائیل ۲۴)

"اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار! جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا ہے تو بھی ان (کے حال) پر رحم فرما۔"

یہ بڑا اہم مضمون ہے اور بہت یاد رکھنے کی چیز ہے۔ اس میں سب سے پہلے بتلایا گیا کہ اگر تمہارے پاس ماں یا باپ یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو انہیں "اف" تک بھی نہ کہنا۔ "اف" کا لفظ عربی زبان میں ناراضگی کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے۔ اردو میں اس کی جگہ "اوہ" اور "اف" دونوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ والدین کے سامنے کوئی ایسا کلمہ بھی نہ بولو جس سے تمہاری طرف سے ادنیٰ ناگواری کا اظہار ہوتا ہو۔ "اف" کا کلمہ کتنا چھوٹا سا ہے، اسے بھی حرام کر دیا اور ایسا حرام کیا کہ اگر کوئی شخص والدین کے آگے یہ کلمہ کہنے کے حرام ہونے کا قائل نہ ہو، کافر ہو جائے گا کیونکہ یہ حکم قرآن مجید میں آ چکا ہے۔

ماں باپ کا ادب ہر مذہب و ملت میں ہے:

ماں باپ کا ادب ہر مذہب و ملت میں ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب والدین کی بے احترامی کی تعلیم نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ باپ کو پکارتے وقت ان کا نام لینے سے

جب کہ تعظیم کے کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ نام لے کر پکارنا اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے غلط نہیں کیونکہ ان کا نام تو وہی ہے جس سے پکارا گیا لیکن چونکہ اس سے ان کی دل شکنی ہوتی ہے اور بے ادبی بھی ہوتی ہے، اس لئے یہ معیوب بھی ہے اور شرعاً بھی ناجائز ہے۔

بیٹھنے کے انداز میں بھی ادب ضروری ہے:

اس کے بعد ایک اہم حکم دیا گیا ہے کہ "وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ" (اور اپنے بازو ان کے آگے جھکا کر رکھو)۔ یعنی جب ان کے آگے بیٹھو تو تن کر نہ بیٹھو۔ ظاہری ہیئت اور انداز بھی ایسا ہونا چاہئے کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ تم کسی عظیم شخصیت کے سامنے بیٹھے ہو۔ جب یہ محسوس کرے کہ تم اس کی تعظیم صرف زبان سے نہیں کر رہے بلکہ تمہارے جسم کی ہیئت بھی تعظیم ظاہر کر رہی ہے۔

پھر آخر میں دعا کرنے کی ہدایت کی گئی کہ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (اے اللہ! ان پر ایسے ہی رحم فرمایئے جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا)۔

"بڑھاپے" کا ذکر کیوں؟

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے گھر میں ہم سے فرمانے لگے کہ قرآن مجید میں یہ جو ارشاد ہے کہ اگر والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کے سامنے اف نہ کہو، نہ انہیں جھڑکو بلکہ ادب سے پیش آؤ۔ قرآن مجید نے یہ کیوں کہا کہ "اگر والدین بوڑھے ہو جائیں تو فلاں فلاں سلوک نہ کرو۔" کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ماں باپ جوان ہوں تو انہیں اف کہنا اور انہیں جھڑکنا جائز ہے یا ان کے ساتھ تعظیم کا معاملہ نہ کرنا جائز ہے؟ ایسا ہرگز نہیں بلکہ جوانی میں ان کا احترام کرنا اور

ان کے متعلق ان سارے احکام پر عمل ضروری ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہوں یا جوان، ان کی تعظیم و تکریم بھی واجب ہے اور ان کے ساتھ کوئی ایسی بات کرنا جائز نہیں جس سے ان کو ذرا سی ادنیٰ تکلیف یا ناگواری پہنچے۔ جب یہ بات ہے تو پھر قرآن مجید میں بوڑھے ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا؟

اس کا جواب خود دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ والدین کے سامنے اف کرنے یا بدتمیزی کرنے کا اندیشہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب والدین بوڑھے ہو چکے ہوں۔ جب وہ باپ جوان ہو تو پھر کسی بیٹے کی کیا ہمت ہے کہ اُسے جھڑک دے۔ باپ جوتا اٹھا کر ایسی پٹائی کرے گا کہ وہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھے گا، یا گھر سے نکال دے گا۔ غرضیکہ جوانی میں باپ کے سامنے بدتمیزی کر نہیں سکتا، جھڑکنا چاہے تو جھڑک نہیں سکتا۔ کبھی اس کی جرأت ہی نہیں ہوگی۔ اس بدتمیزی کی جرأت اس وقت ہوگی جب والدین بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ اس وقت خطرہ ہے کہ بیٹے کے ذہن میں یہ خناس پیدا ہو جائے کہ اب تو میں ان کو پال رہا ہوں۔ اس لئے یہ فرمایا کہ اگر بڑھاپا آ جائے تو یہ یہ کام کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوانی میں بدتمیزی کرنا جائز ہے۔

دوسری وجہ

اس کی دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ بڑھاپے میں عام طور پر مزاج میں چڑچڑاپن اور جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ کوئی ادنیٰ سی بات بھی طبیعت کے خلاف ہو جائے تو اس پر غصہ زیادہ آتا ہے۔ بعض اوقات ایسی بات پر بھی غصہ آ جاتا ہے جو غصہ کے قابل نہیں ہوتی۔ اور بعض مرتبہ بوڑھے ایسی چیزوں پر بھی روک ٹوک کرتے ہیں جو روکنے ٹوکنے کی نہیں ہوتیں۔ اس وقت اولاد کا امتحان ہوتا ہے کہ

"جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی"۔

تیسرے نمبر پر جھوٹی گواہی کا ذکر فرمایا۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ بار بار یہ تینوں باتیں ارشاد فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ "کاش آپ خاموش ہو جائیں"۔ بار بار بولنے سے آپ کو تکان اور تعب ہو رہا ہوگا۔ لیکن آپ امت کی شفقت اور خیر خواہی کے لئے بار بار ارشاد فرما رہے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تین گناہ کتنے خوفناک گناہ ہیں۔ اور ان گناہوں میں شرک کے بعد والدین کی نافرمانی کا ذکر ہے۔

والدین کے ساتھ بدسلوکی کتنی ہولناک چیز ہے؟

غور کیجئے! اول تو کبیرہ گناہ خود ایسی چیز ہے کہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتا اور یہ کبیرہ گناہ وہ ہے جو بندوں کے حقوق سے متعلق ہے اور حقوق العباد کے متعلق یہ ضابطہ ہے کہ جب تک صاحب حق اپنے حق کو معاف نہ کرے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں فرماتے۔ پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ شرک اور اس کے بعد والدین کے ساتھ بدسلوکی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والدین کے ساتھ برا برتاؤ اور بدسلوکی کتنی خوفناک اور ہولناک چیز ہے۔

والدین کو گالی دینے کی ایک صورت:

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مِنَ الْكَبَائِرِ سَبُّ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ﴾

"کبیرہ گناہوں میں سے ایک کبیرہ گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے۔"

صحابہ کرام نے تعجب سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿یَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَیَسُبُّ اَبَاہُ وَیَسُبُّ اُمَّہٗ فَیَسُبُّ اُمَّہٗ﴾ (صحیح مسلم، باب الکبائر و اکبرھا ۱/۶۴)

"آدمی کسی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے، جواب میں اس کے باپ کو گالی دیتا ہے، اسی طرح کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے جس کے نتیجے میں دوسرا اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہوں۔"

یعنی کوئی شخص دوسرے کے والدین کو گالی دینے کی وجہ سے اپنے والدین پر گالی پڑنے کا سبب بنا۔ یہ بھی ایسا ہی ہو گیا کہ گویا اس نے خود اپنے والدین کو گالی دی۔ اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا۔

والدین کو گالی دینا کئی خرابیوں کا مجموعہ ہے

ہمارے ہاں گالی دینے کا عام رواج ہے۔ لوگ گالیاں دیتے وقت کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ دوسروں کو ماں کی گالی بھی دیتے ہیں اور باپ کی گالی بھی دیتے ہیں۔ وہ اس کے جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

گالی دینا ایک مستقل کبیرہ گناہ ہے۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے:

﴿سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ﴾

(مشکوۃ، کتاب الآداب)

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتل کرنا کفر کے قریب ہے''

گالی دینا تو ویسے ہی بُرا ہے اور کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا اور زیادہ بُرا ہے اور اس نے جواب میں اس کے والدین کو بھی گالی دے دی تو تیسری خرابی اس کے اندر پیدا ہوگئی۔ پہلی خرابی گالی کی، دوسری خرابی دوسرے کے والدین کو گالی دینے کی، تیسری خرابی، اپنے والدین پر گالی پڑنے کا ذریعہ بننے کی۔ کسی کے والدین کو گالی دینا اس لحاظ سے بھی بُرا ہے کہ تمہارا جھگڑا اگر کسی سے ہے تو تمہیں صرف اس سے نمٹنے کا حق ہے۔ اس کے والدین کی بے عزتی کا کوئی حق حاصل نہیں۔ تمہیں اس کے ماں باپ نے نہیں ستایا بلاوجہ ان کو درمیان میں لانا بہت بڑا جرم ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا گناہ ہونے کے علاوہ کئی خرابیوں کا مجموعہ بھی ہے۔

ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے

ایک حدیث میں بطور خاص والدہ کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْأُمَّهَاتِ﴾

(مشکوٰۃ، کتاب الآداب)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر والدہ کے ساتھ بدسلوکی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔''

والدہ کا الگ ذکر کرکے اس کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت کا ذکر کرنے کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ماں کے حقوق کی تاکید دوسری احادیث میں بھی زیادہ آئی ہے۔

ساتھی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے وہ بھی اپنے ساتھ کچھ حقوق رکھتی ہے۔
اس کے حقوق کو بھی قرآن مجید اور احادیث میں جگہ جگہ اور تفصیل سے بیان کیا گیا۔

اب آزمائش شروع ہوتی ہے۔ ادھر بیوی کے حقوق ہیں ادھر والدین کے
حقوق ہیں۔ جب اولاد ہو جاتی ہے تو آزمائش میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر بچہ اپنے
حقوق ساتھ لے کر آتا ہے۔ اب اس کی بیوی اور بچوں کے بھی حقوق ہیں، اور ماں
باپ اور بہن بھائیوں کے بھی حقوق ہیں۔ بسا اوقات ساتھ رہنے کی وجہ سے حقوق کا
ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔ بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں تو ماں ناراض ہوتی ہے۔
ماں کے ساتھ ادب و احترام اور اطاعت گزاری کا معاملہ کرتے ہیں تو بیوی ناراض
ہوتی ہے۔ ساس بہو کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا ا
ور نازک مسئلہ ہے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اس سے عافیت کے ساتھ پار ہو
جانا آسان نہیں۔ اس میں بڑی دیانتداری اور خدا کے خوف کی ضرورت بھی ہوتی ہے
اور سمجھداری اور احتیاط کی بھی۔ اس کے علاوہ کسی رہبر و رہنما کی بھی ضرورت ہوتی
ہے۔ ہر آدمی کو سارے مسائل معلوم نہیں ہوتے۔ رہبر کے سامنے اپنے مسائل اور
مشکلات پیش کرتے اور ان کی ہدایات کی روشنی میں ان مشکلات کو حل کرنے کی
کوشش کرتا رہے تو بہت آسانی ہو جاتی ہے۔

ساس بہو کے جھگڑوں کی ایک اہم وجہ اور اس کا حل:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بار بار فرمایا کہ عام طور پر ساس بہو
کے جھگڑے شادی کے بعد زیادہ تر مشترک رہائش کی وجہ سے پیدا ہوتے
ہیں۔ ایک ہی مکان میں ماں باپ بھی رہتے ہیں اور بیوی بچے بھی رہتے ہیں۔ کبھی
ماں باپ کو شوہر کی بیوی بچوں سے تکلیف پہنچتی ہے یا کبھی بہو اور اس کے بچوں کو

والوں دونوں سے تکلیف پہنچتی ہے جس کی وجہ سے شوہر کی جان عذاب میں آجاتی ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ کوشش کرو کہ شادی کے بعد زیادہ عرصے تک ساتھ نہ رہنا پڑے بلکہ جلدی الگ الگ ہو جاؤ۔ اور اگر گھر بڑا ہے تو کم از کم یہ تو ضروری ہے کہ بیوی کے لئے بالکل ایک الگ کمرہ ایسا ہو جس میں وہ تالا لگانا چاہے تو لگا سکے اور اس کی چابی صرف اسی کے پاس اور اس کے شوہر کے پاس ہو۔ وہ عورت اپنے کمرے میں جو چاہے رکھے، جب چاہے کھولے، بند کرے، جس کو چاہے آنے دے، جس کو چاہے نہ آنے دے۔ یہ اس کا بنیادی حق ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسی صورت میں بھی کوشش کریں کہ چولہا مشترک نہ رہے کیونکہ ساری آگ چولہے سے لگتی ہے۔ یہ دونوں باتیں بڑی حکیمانہ ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ان دو باتوں کے ہونے کی وجہ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

اس رہائش میں اگر شوہر ماں باپ کے حقوق بھی ادا کرے تو اس طرح کی مشترک رہائش کی اس وقت تک گنجائش ہے جب تک جھگڑے پیدا نہ ہوں اور اگر خدانخواستہ جھگڑے شروع ہونے لگیں تو رہائش فوراً الگ کر دینی چاہئے۔ ورنہ سخت خطرہ ہے کہ یا تو ماں باپ کے حقوق مارے جائیں گے یا بیوی بچوں کے حقوق مارے جائیں گے۔ اور یہ بھی خطرہ ہے کہ ماں باپ کی طرف سے اس کے بیوی بچوں کے ساتھ بدسلوکی ہو جائے گی یا بیوی بچوں کی طرف سے اس کے ماں باپ کے ساتھ بے ادبی کا معاملہ ہو جائے گا۔ جس سے وہ گنہگار ہوں گے۔

رشتہ داروں کے ساتھ قطع رحمی:

جس طرح والدین کے ساتھ بدسلوکی کی وعیدیں احادیث میں مذکور ہیں۔

رشتہ داروں کے دوستوں سے
حُسنِ سُلوک کی اہمیت

رشتے داروں کے دوستوں سے حسن سلوک کی اہمیت

خطبہ مسنونہ:

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔

اما بعد!

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَبَرِّ الْبِرِّ اَنْ یَّصِلَ الرَّجُلُ اَھْلَ وُدِّ اَبِیْہِ

(صحیح مسلم، باب فضل صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوہما، کتاب البر والصلۃ)

تمہید:

بزرگان محترم اور برادران عزیز!

آج کی مجلس میں اس حدیث کا بیان مقصود ہے کہ جس طرح والدین اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے اسی طرح ان کے اہل محبت اور

دوستوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرنا بھی ضروری ہے۔ تو بیوی کے رشتے دار اور اس سے محبت کا تعلق رکھنے والیوں کا خیال رکھنا بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

اس بات کی طرف توجہ بہت ہی کم ہے۔ والدین کے حقوق تو سب جانتے ہیں۔ رشتے داروں کے حقوق بھی کسی نہ کسی درجے میں لوگ جانتے ہیں لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ ان سے تعلق رکھنے والوں کے بھی حقوق ہیں۔ آج ہم اس سے متعلق چند احادیث کی تشریح بیان کریں گے۔

سب سے اچھا حسن سلوک:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿إِنَّ مِنْ أَبَرِّ الْبِرِّ أَنْ يَصِلَ الرَّجُلُ أَهْلَ وُدِّ أَبِيهِ﴾ (صحیح مسلم)

"حسن سلوک میں سب سے اچھا حسن سلوک یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔"

مطلب یہ کہ آدمی اپنے والد کے ساتھ تو حسن سلوک کرتا ہی ہے لیکن ان کے دوستوں اور محبت کرنے والوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتا ہے تو ایسا شخص اپنے والد کے ساتھ سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والا ہے۔ کیونکہ یہ بھی بالواسطہ اپنے والد ہی کے ساتھ حسن سلوک ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ:

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ سفر کر کے جارہے تھے۔ راستے میں ایک اعرابی

علاء اعرابی (بدو) ان عربوں کو کہتے ہیں جو شہروں میں نہیں رہتے بلکہ صحراؤں میں اور چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں رہتے ہیں)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے سلام کیا۔

عرب میں رواج تھا کہ عام طور پر تو اونٹ پر سواری کرتے تھے لیکن اونٹ کی سواری قدرے مشکل ہوتی تھی، مسلسل کئی میل اونٹ کی سواری کرنے سے آدمی تھک جاتا ہے کیونکہ اس میں جھٹکے بہت لگتے ہیں تو عرب گدھا بھی ساتھ رکھ لیتے تھے، جب اونٹ پر سواری کرتے کرتے تھک جاتے تو گدھے پر سواری کرنے لگتے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس اسی عادت کے موافق ایک گدھا تھا۔ جب یہ اعرابی آپ سے ملا تو آپ نے اسے یہ گدھا تحفے کے طور پر دے دیا۔ اس دور میں گدھا بہت قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی۔ گدھے کے علاوہ ان کے پاس ایک عمامہ تھا، وہ بھی ہدیے میں دے دیا۔

آپ کے شاگرد عبداللہ بن دینار ساتھ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے استاذ سے عرض کیا کہ یہ بدو لوگ چھوٹی سی چیز پر بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اتنا قیمتی ہدیہ انہیں کیوں دیا جب کہ وہ آپ کی ضرورت کا تھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب میں فرمایا:

﴿إِنَّ أَبَا هٰذَا كَانَ وُدًّا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ﴾

(صحیح مسلم، باب فضل صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما)

"اس کا باپ میرے والد عمر بن الخطاب کا دوست تھا۔"

اس اعرابی کا باپ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دوست تھا۔ خود یہ اعرابی دوست نہیں تھا لیکن اس کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی اتنی رعایت کی کہ ہدیے میں عمامہ اور گدھا اسے دے دیا۔ اور پھر اس کی وجہ بیان کی کہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں ہے کہ "سب سے اچھا حسن سلوک یہ ہے کہ آدمی اچھا سلوک کرے اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ"۔ یہ وہی حدیث ہے جو پیچھے گزری۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خاص شان:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک خاص شان ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی اور اس پر عمل کرنے کا بہت اہتمام کیا اور اس پر عمل کا ان کو اتنا شوق تھا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی سنتوں کو تلاش کر کے ان کی پیروی کرتے تھے جس کی طرف عام طور پر لوگوں کا ذہن نہیں جاتا۔ مثلاً انہوں نے وہ جگہیں یاد کر رکھی تھیں جہاں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سفر میں قیام فرمایا تھا چنانچہ مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ آتے جانے کے سفر میں یہ بھی وہاں وہاں ٹھہرتے تھے جہاں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اترے تھے۔ اور یہ بھی آپ کو یاد تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں کہاں نماز پڑھی تھی، اسی جگہ نماز پڑھتے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی اعلیٰ مثال ہے۔ انہی مقامات پر قیام کرنا اور انہی جگہوں پر نماز پڑھنا شرعاً فرض ہے نہ واجب اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی حکم دیا اور ایسا نہ کرنے سے کسی قسم کا کوئی گناہ یا کراہت بھی نہیں لیکن انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی پیروی کرنے کا عشق تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو یہ تھا کہ والد کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے بھی بڑھ کر عمل کیا کہ والد کے دوست کے بیٹے کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا اور حسن سلوک بھی اتنا بڑا کہ حالت سفر میں اپنی ضرورت کی چیز (گدھا) اسے ہدیہ کے طور پر عطا فرما دیا۔

مذکورہ واقعہ سے متعلق دیگر روایات:

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت اس اعرابی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس گدھے پر سوار تھے لیکن اسے دیکھ کر اس کے ادب میں گدھے سے اتر گئے اور اسے ہدیہ کے طور پر گدھا اور عمامہ دے دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ اترنے کے بعد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے پوچھا کہ آپ فلاں ابن فلاں کے بیٹے ہیں ناں؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر آپ نے اسے یہ ہدیہ دیا۔ اور جب ساتھیوں نے سوال کیا تو اس کی وجہ یہ بیان کی کہ:

﴿سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّ مِنْ أَبَرِّ الْبِرِّ أَنْ يَصِلَ الرَّجُلُ أَهْلَ وُدِّ أَبِيْهِ بَعْدَ أَنْ يُوَلِّيَ﴾ (صحیح مسلم بحوالہ بالا)

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حسن سلوک میں سب سے زیادہ سلوک ایک یہ ہے کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ محبت کے تعلق والوں سے اچھا سلوک کرے۔"

اس روایت میں یہ اضافہ ہے کہ والد کے انتقال کے بعد یہ سلوک ہو۔

والد کے اہلِ تعلق:

یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس کی بہت سی جزئیات ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے والد کے اہل تعلق کا جائزہ لے۔ ان کا کن کن سے محبت کا تعلق ہے۔ سب سے جو قریبی

رشتہ دار ہیں مثلاً والدہ، دادا، دادی، چچا، تایا اور پھوپھیاں ان کے ساتھ اس کا قریبی تعلق تھا۔ اس کے بعد والد کے چچا زاد بھائی، تایا زاد بھائی، ماموں زاد بھائی وغیرہ۔ ان کے بعد دوستوں کا نمبر آتا ہے تو جتنا جتنا جس کا والد کے ساتھ قریبی تعلق تھا اتنا اس کا حق بھی زیادہ ہے اور جو جتنا دور ہوتا جائے گا، اس کا حق بھی پیچھے ہوتا جائے گا۔

دو حق:

والدہ کا ایک حق تو ماں ہونے کی حیثیت سے ہے اور وہ اتنا زبردست حق ہے کہ از روئے حدیث جنت ماں کے قدموں تلے ہے لیکن اس حق کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے وہ یہ کہ والدہ باپ کی بیوی ہے، اور باپ کا اس سے گہرا تعلق تھا۔ اس حیثیت سے ماں کا حق اور بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح دادا، دادی کا حق، دادا، دادی ہونے کی وجہ سے تو ہے ہی لیکن اس اعتبار سے اور بڑھ جاتا ہے کہ وہ والد کے والدین ہیں۔ اسی طرح دوسرے رشتے داروں کا معاملہ ہے گویا ان کے دو حق بن جاتے ہیں۔ ایک اپنا دوسرا والد کی وجہ سے۔

پچھتاوے کا علاج:

والد اپنی زندگی میں تو اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ خود حسن سلوک کرتے رہتے ہیں۔ والد کے رخصت ہونے کے بعد اب ان کا یہ حق ہے کہ آپ ان کے ساتھ حسن سلوک اور اکرام کا معاملہ کریں۔ بہت سے لوگوں کو یہ حسرت ہوا کرتی ہے کہ ہم اپنے والد کی زندگی میں ان کی خدمت نہ کر سکے۔ اس پچھتاوے کا ایک علاج یہ ہے کہ والد کے انتقال کے بعد اس کی خدمت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس کے رشتے داروں اور اہل محبت سے حسن سلوک کرو۔

والدین کے انتقال کے بعد ان سے حسن سلوک کے طریقے:

حضرت ابو اسید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ قبیلہ بنو سلمہ کا ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرے والدین کے حسن سلوک میں سے اب کوئی ایسا کام باقی ہے کہ ان کے انتقال کے بعد وہ کرلوں اور وہ والدین کے لئے حسن سلوک میں شمار ہو جائے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں ہے آپ نے پانچ کام بتائے۔

پہلا یہ کہ الصَّلٰوۃُ عَلَیْھِمَا (ان کے لئے دعا کرنا)

دوسرا یہ کہ الاِسْتِغْفَارُ لَھُمَا (ان کے مغفرت کی دعا کرنا)

تیسرا یہ کہ اِنْفَاذُ عَھْدِھِمَا مِنْ بَعْدِھِمَا (اگر انہوں نے اپنی زندگی میں کسی سے کوئی عہد کر رکھا تھا اور وہ پورا نہیں کر سکے تھے تو ان کے انتقال کے بعد اس عہد کو پورا کرنا)۔

چوتھا یہ کہ صِلَۃُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصَلُ اِلَّا بِھِمَا (ان کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا)۔

پانچواں یہ کہ اِکْرَامُ صَدِیْقِھِمَا (ان کے دوستوں کا اکرام اور عزت کرنا)۔

(ابو داؤد، رقم ۵۱۴۲، ابن ماجہ، حدیث ۳۶۶۴)

یہ پانچوں کام کرنا یا ان میں سے کوئی کام کرنا ایسا ہے جو گویا زندگی میں خدمت کر رہے ہوں بلکہ یہ خدمت اس خدمت سے بہت اونچے درجے کی ہے کہ ان کی وجہ سے انہیں قبر اور آخرت میں راحت ملتی ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر رشک:

جس طرح والد کے دوستوں سے حسن سلوک کا حکم ہے۔ اسی طرح بیوی کی

خوبیوں سے اچھا برتاؤ کرنے کا تذکرہ بھی احادیث میں ملتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَا غِرْتُ عَلٰى أَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مَا غِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَمَا رَأَيْتُهَا قَطُّ

(صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل خدیجہ)

"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی بیوی پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آیا حالانکہ میں نے انہیں دیکھا نہیں۔"

جب ایک شخص کی کئی بیویاں ہوتی ہیں تو ان کے درمیان باہمی مقابلہ اور منافست ہوتی ہے اور ہر ایک کے اندر دوسرے سے آگے بڑھنے اور شوہر کی نگاہ میں زیادہ پسندیدہ ہونے کا جذبہ ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سلوک دوسری ازواج کے ساتھ تھا وہ ان سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ اس لئے دوسری بیویوں میں کسی کی خصوصیت نہیں ہوئی اور نہ ہی ان پر کبھی رشک آیا البتہ مجھے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر رشک آتا تھا حالانکہ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مختصر تذکرہ

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی بیوی تھیں اور مکہ مکرمہ کے اندر ہی آپ کا انتقال ہوا۔ عمر کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی تھیں۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے کڑے وقت میں ساتھ دیا جب مکہ کے اندر آپ کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے اور مکہ مکرمہ میں

ایک ایک دن گذارنا مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو یہ آپ کے لئے بہت بڑا صدمہ اور غم تھا۔ اسی کے قریب زمانہ میں آپ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہوا۔ ان دو ظاہری سہاروں کے ہٹنے کے بعد جلد مکہ کی جڑائیں بڑھ گئیں۔ جس کے نتیجے میں بالآخر ہجرت کا واقعہ پیش آیا۔

رشک کی وجہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر اس لئے رشک آتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کثرت سے کیا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بکری ذبح کرتے۔ اس کے الگ الگ ٹکڑے کرتے اور انہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے پاس تحفے کے طور پر بھیجتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل دیکھ کر ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے عرض کیا:

﴿كَأَنْ لَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا إِلَّا خَدِيْجَةُ﴾

"(آپ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں) گویا دنیا میں ان کے سوا کوئی خاتون تھی ہی نہیں۔"

اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے فضائل بیان کرتے اور ایک وجہ یہ بیان فرماتے کہ میری اولاد انہی سے ہوئی ہے۔ (صحیح مسلم حوالہ بالا)

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اپنی ازواج میں سے صرف حضرت خدیجہ سے ہی ہوئی ہے۔ آپ کے صاحبزادے ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے ہوئے۔ لیکن وہ آپ کی باندی تھیں بیوی نہ تھیں۔)

بیوی کے رشتہ داروں کے حقوق:

جب بیوی کی سہیلیوں کے یہ حقوق ہیں تو پھر بیوی کے والدین، اس کے بہن بھائی، اگر سابق شوہر سے اولاد ہے تو ان کے حقوق کتنے زبردست ہوں گے۔ بیوی کی زندگی میں ان کے حقوق بدرجہ اولیٰ ادا کئے جائیں گے اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ حسن سلوک کا راستہ یہ ہے کہ اس کے رشتہ دار اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن کے آنے پر مسرت کا اظہار:

ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائیں۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں موجود تھے۔ آپ نے ان کی آواز سنی تو اس میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی آواز کی شباہت آئی۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشی ہوئی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ هَالَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ (صحیح مسلم)

"یا اللہ! یہ تو ہالہ بنت خویلد آگئیں۔"

گویا آپ نے ان کے آنے کا اہتمام فرمایا اور خوشی کا اظہار فرمایا تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ میرے آنے سے انہیں خوشی ہوئی ہے۔ اس سے سالی کا حق معلوم ہوا البتہ یہ یاد رہے کہ سالی محرم نہیں ہے۔ اس سے پردہ ہے لیکن اس کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرنا اپنی بیوی کا حق ہے۔

سسرال کی خدمت: تعلق زوجیت کا ایک تقاضا:

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ شوہر کے لئے بیوی کے ماں باپ اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ضروری ہے تو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ بیوی کو بھی چاہئے کہ وہ شوہر کے والدین، اس کے بہن بھائی اور رشتے داروں کی خدمت کرے۔ گویا بیوی پر اپنے سسرال کی خدمت اور شوہر پر اپنے سسرال کی خدمت کا حق بھی ثابت ہوگیا۔ اور یہ تعلق زوجیت کا ایک تقاضا ہے۔

ساس سسر اور بہو ایک دوسرے کو اپنے لئے نعمت سمجھیں:

آج کل ساس بہو کے قصے بہت چلتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب ساتھ رہیں گے تو ہر ایک کی طبیعت کے خلاف کچھ نہ کچھ تو پیش آئے گا۔ اسے برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن ساتھ رہنے میں بہت سے فائدے بھی ہوتے ہیں۔ شادی ہوئی، نئی نویلی دلہن آئی، اسے زیادہ تجربہ نہیں ہوتا، نہ کھانا پکانے کا، نہ کپڑے سینے کا اور نہ گھرستی کو سنبھالنے کا۔ سال ڈیڑھ سال بعد بچوں کی آمد شروع ہوتی ہے، ان کی پرورش اور دیکھ بھال ساس سسر کی موجودگی میں آسان ہوتی ہے۔ برکت رہتی ہے، ان کا تجربہ شامل حال رہتا ہے، ان کی دعائیں ملتی ہیں۔ اگر بہو یہ باتیں سوچ کر ساس سسر کو اپنے لئے نعمت سمجھے اور ساس سسر بہو کو اپنے لئے بیٹی سمجھیں اور نعمت سمجھیں کہ ہمارے بیٹے کا گھر اس کے ذریعے آباد ہوا ہے۔ یہ اپنی جان کھپا کر ہمارے بیٹے کی اولاد کی پرورش کر رہی ہے۔

بہو کو بیٹی بنا کر لے آؤ:

تب جا کر احسان بھی جتائیں اور اس سے محبت بھی ایسی کریں جیسے بیٹی سے کرتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا، ہمارے ایک قریبی عزیز اپنے بیٹے کا رشتہ اپنے بہت ہی قریبی عزیز کے ہاں لڑکی سے کرنا چاہتے تھے۔ مجھ سے مشورہ کیا، میں نے کہا بہت اچھی بات ہے۔ انہوں نے کچھ اشکال ظاہر کیے اور کہا کہ ویسے تو اس کے اندر بہت خوبیاں ہیں لیکن فلاں فلاں باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تعلقات خراب ہو جائیں۔ اس دن حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کے ہاں دعوت تھی۔ ان کا حضرت سے اصلاحی تعلق تھا۔ وہ بھی وہاں تھے اور میں بھی وہیں گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ حضرت عارفی صاحب سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ساری صورتحال عرض کی اور یہ اشکال بھی ظاہر کیا کہ اس کے اندر فلاں فلاں باتیں ہیں جس کی وجہ سے رشتہ کرنے میں تامل ہے۔ آپ نے عجیب حکیمانہ جواب دیا۔ فرمایا کہ یہ ساری باتیں اگر آپ کی بیٹی کے اندر ہوتیں تو آپ کیا کرتے؟ انہوں نے کہا کہ برداشت کرتے۔ فرمایا کہ یہاں بھی وہی کام کرلو۔ بیٹی بنا کر لے آؤ اور ان کمزوریوں کو برداشت کرلو۔ جب اس کے اندر اتنی خوبیاں ہیں تو کچھ نہ کچھ کمزوریاں تو ہر ایک کے اندر ہوتی ہیں۔

اسی وقت ان کے دل میں بات اتر گئی اور اگلے دن رشتے کا پیغام دے دیا۔ الحمد للہ بڑا کامیاب رشتہ ہوا اور تعلقات بہت اچھے ہیں۔

بیوی کی قربانیوں کا خیال رکھنا شرافت کا تقاضا ہے:

بات یہی ہے کہ ساس سسر آنے والی لڑکی کو اپنی بیٹی بنائیں اور یہ تصور کریں کہ آنے والی کتنی قربانیاں دے کر آئی ہے۔ جن ماں باپ نے بچپن سے اس کو پالا تھا، جن بہن بھائیوں میں اس نے زندگی گزاری تھی، جس گھر سے وہ کبھی دور نہیں تھی، اس نے وہ سب کچھ چھوڑ کر ایک شوہر کی خاطر اپنی زندگی کے اندر ایک عظیم

انقلاب برپا کیا۔ شرافت کا تقاضا ہے کہ اس قربانی کا لحاظ کیا جائے۔ شوہر بھی خیال کرے، ساس سسر بھی خیال کریں اور نندیں اور دیور بھی خیال کریں۔

بہو کیلئے ساس سسر کی خدمت کرنا شرعاً ضروری نہیں، پسندیدہ ہے

خوب یاد رکھئے کہ عورت کی شرعی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ ساس سسر کی خدمت کرے بلکہ بیٹے سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی خدمت کرے البتہ اس کے حق میں بہتر ہے کہ وہ اپنے ساس سسر کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرے جیسے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کرتی ہے کیونکہ بیوی پر شوہر کا تو حق ہے تو شوہر کے تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے تعلق والوں سے بھی احترام کا معاملہ کیا جائے۔ لہٰذا وہ ان کی جو کچھ خدمت کر سکے بڑی خوشی سے کرے لیکن ساس سسر کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ فلاں فلاں کام کرو۔

بہو کو نوکرانی کی طرح رکھنا جائز نہیں:

بعض عورتیں اپنی بہو کو اس طرح رکھتی ہیں کہ جس طرح کوئی باندی اور نوکرانی آگئی ہو۔ اب سے پہلے کام کرنے کے لئے ملازمہ تھی، اب یہ آگئی ہے۔ صاحبزادے تو کہیں دور ملازمت کرتے ہیں یا باہر ملک رہتے ہیں اور بیوی کو ساس سسر نندوں اور دیوروں کے حوالے کر گئے۔ وہ بیچاری سسرال میں ان کی خدمت کرتی رہتی ہے۔ ساس کا حکم بھی اس پر چلتا ہے، سسر کا حکم بھی چلتا ہے۔ دیوروں اور نندوں کا حکم بھی چلتا ہے۔ جتنے مہمان آتے ہیں، ان کی خاطر داری بھی اسی کی ذمہ داری میں شامل ہوتی ہے اور ذرا سی کمی ہو جائے تو پھر طعن و تشنیع کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ظلم ہے اور ناجائز ہے۔ شریعت نے کسی ساس سسر کو بالکل یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنی

بہو کو کام کرنے پر مجبور کریں۔ یہ باہمی رواداری کے معاملات ہیں ان میں زبردستی جائز نہیں۔

بہو کا ایک غلط طرزِ عمل:

بعض مرتبہ الٹا معاملہ ہوتا ہے۔ بیوی شوہر کو اس کے والدین اور خاندان سے کاٹنے کی فکر میں رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر وہ ماں باپ کی خدمت کرتا ہے یا ان پر کچھ خرچ کرتا ہے تو اس میں رکاوٹیں ڈالتی ہے۔ نہ اس کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ اپنا خرچہ تو مانگ سکتی ہے اور شوہر پر بھی فرض ہے کہ وہ ادا کرے لیکن جب بیوی کو اپنا پورا حق مل رہا ہو اور بچوں کا حق بھی مل رہا ہو تو اب اسے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تم اپنے بہن بھائی کو نہ دو، اپنے والدین پر خرچ نہ کرو وغیرہ۔ اس میں مداخلت کرے گی تو تعلقات خراب ہوں گے۔ میاں بیوی کے جھگڑے کھڑے ہوں گے۔

حقوق کی ادائیگی میں اعتدال ضروری ہے:

بہرحال! شریعت میں اعتدال اور توازن ہے انتہا پسندی نہیں۔ دونوں طرف حقوق کی ادائیگی کا پہلو پیش نظر رہے تو ساس بہو کے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں شوہر بھی سمجھداری سے کام لے۔ نہ ماں باپ کی طرف اتنا جھکے کہ اس سے بیوی کے حقوق تلف ہونے لگیں اور نہ بیوی کی طرف اتنا زیادہ جھکے کہ ماں باپ کے حقوق فوت ہو جائیں۔ اعتدال سے رہنا ضروری ہے کہ بیوی بچوں کے حقوق بھی ادا ہوں اور ماں باپ کے بھی۔ البتہ یہ آسان کام نہیں۔ اس کے لئے رہبر و رہنما کی اور شرعی مسائل کو سمجھنے اور جاننے کی ضرورت ہے اور اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے دور میں ہمارا ایک واقعہ

ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی کے آخری چار سال صاحب فراش رہے۔ دل کی تکلیف تھی۔ ہمارے دو بڑے بھائی شہر میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اتوار کی چھٹی ہوتی تھی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر ہر اتوار کو ملنے آیا کرتے تھے۔ ہمارے والدین ہفتہ بھر ان کی انتظار میں رہتے، اور اتوار کے دن تو دھیان بالکل اسی طرف لگا رہتا۔ شام کے قریب آیا کرتے تھے۔ عصر کے بعد والد صاحب کی نظریں دروازے پر ہوتیں۔ پانچ منٹ بھی دیر ہوتی تو انہیں مشکل محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ آ جاتے تو ہمارے گھر میں عید کا سا سماں ہو جاتا۔ سب خوش ہوتے، ہنستے بولتے، والد صاحب کے پاس بیٹھتے۔

کبھی وہ رات تو رہنے کے ارادے سے آتے۔ کبھی صرف رات کا کھانا کھا کر واپس جانے کے ارادے سے آتے اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی واپس جانے کا پروگرام ہوتا تھا۔ مگر جو کچھ بھی ہوتا تھا پہلے سے طے ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ آئے ہوئے تھے اور پروگرام کھانا کھانے کا نہیں تھا، رہنے کا بھی نہیں تھا۔ مغرب کے بعد جانے کو تھا۔ ہم دونوں بھائی، میں اور مولانا تقی عثمانی صاحب اپنے بڑے بھائیوں کے سر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ آج رات آپ یہیں رہیں یا کم از کم کھانا کھا کر جائیں۔ لیکن وہ جانا چاہ رہے تھے۔

ہماری یہ باتیں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سن رہے تھے جو برابر کے ایک اور کمرے میں تھے۔ انہوں نے مجھے اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کو علیحدگی میں بلایا اور فرمایا کہ تم تو انہیں رکنے پر اصرار کر رہے ہو۔ تم نے اپنی بیویوں سے پوچھ لیا ہے کہ کیا ان کے پاس اتنے آدمیوں کے کھانے کا انتظام ہے؟ ہم نے عرض

کیا کہ ہم نے تو نہیں پوچھا۔ فرمایا کہ تمہاری تو زبان بچ گئی۔ ساری مشقت تو تمہاری بیویوں پر پڑے گی۔ اگر انہوں نے پہلے سے تیاری نہیں کر رکھی تو انہیں پریشانی ہوگی، انہیں روکنے سے پہلے تمہیں یہ بات دیکھنی چاہئے تھی کہ آپ کی بیویاں آسانی اور خوشی سے ان کے کھانے کا انتظام کرسکیں گی یا نہیں۔ ایسا سبق دے گئے کہ الحمدللہ، اب وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ رکتے تو خود انہیں کتنی خوشی ہوتی، ہم سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی لیکن ہمارے اس عمل پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ شریعت کی رعایتیں ہیں، جنہیں اللہ والے جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)
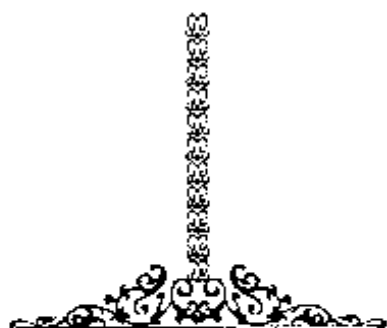
وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین

اللہ والوں کی صحبت میں رہنے کے ثمرات

﴿اللہ والوں کی صحبت میں رہنے کے ثمرات﴾

خطبہ مسنونہ:

نحمدهٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم.

اما بعد!

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "اَلرَّجُلُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُخَالِلُ". (رواہ ابوداؤد والترمذی)

و قال علیہ الصلوٰۃ والسلام:

"لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَ لَا یَاْکُلْ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ".

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

تمہید

آج ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ والوں سے ملنے کے لئے جانا ان کی صحبت میں بیٹھنا۔ ان کو دیکھنا اور ان کی باتیں سننا ان سب کے اندر بڑی خیر ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند احادیث آرہی ہیں۔

صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کا ام ایمن کی زیارت کیلئے جانا

ایک حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہمیں "ام ایمن" کے پاس لے چلو۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا وہ خاتون تھیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں حصہ لیا تھا۔ درحقیقت آپ کے والد کی باندی تھیں۔ پھر ترکہ میں آپ کے حصہ میں آگئیں۔ جب آپ بڑے ہوئے تو آپ نے انہیں آزاد کر دیا اور اپنے متبنیٰ بیٹے زید بن حارثہ سے ان کا نکاح کر دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بہت اکرام اور احترام فرماتے تھے۔

کہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور کہاں ام ایمن ایک آزاد کردہ باندی، لیکن چونکہ انہوں نے آپ کی پرورش میں حصہ لیا تھا اس لئے آپ ان کا اکرام بھی فرماتے اور ان کی زیارت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا خاص شوق تھا اس لئے ان کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ام ایمن کی زیارت کے لئے تشریف لے جائیں۔ لہٰذا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ خواہش کی کہ وہ انہیں حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے پاس لے چلیں۔

جب یہ دونوں حضرات پہنچے تو ام ایمن انہیں دیکھ کر رو پڑیں۔

یہ حضرات یوں سمجھے کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں رو رہی ہیں۔ اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ

"اب تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات عطا

فرمائی ہے، وہ آپ کے حق میں دنیا کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے"

ام ایمن نے فرمایا کہ میں اس لئے نہیں رو رہی کہ مجھے یہ بات معلوم نہیں جو آپ نے ذکر فرمائی۔ میں اس لئے رو رہی ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ بات سن کر یہ دونوں بھی رونے لگے۔

(مسلم، بحوالہ ریاض الصالحین ص ۱۷۰)

اس حدیث کو یہاں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے، صحابہ نے بھی اس کا اتباع کیا، اور ان کی زیارت کے لئے پہنچے۔

بزرگوں کی زیارت کے لئے جانا مستقل سنت ہے:

آپ اندازہ کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس قدر مصروف تھی۔ آخری دور میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر آپ کی حکومت تھی۔ جزیرہ نمائے عرب آج تقریباً ایک درجن ملکوں اور ریاستوں پر تقسیم ہو گیا ہے۔ سعودی عرب، بحرین، کویت، دوبئی، شارجہ، ابوظبی، قطر، مسقط اور عمان یہ سارے ممالک جزیرہ نمائے عرب میں شامل ہیں۔ اتنے بڑے علاقے کی حکومت کی وجہ سے آپ کی مصروفیت کتنی زیادہ ہوتی ہوگی۔ پھر آپ آخری نبی بھی ہیں۔ امت کی تعلیم و تربیت کا کام بھی آپ کے ذمے تھا۔

اس کے علاوہ آپ عدالتی فیصلے بھی فرماتے تھے۔ جہاد کی کمان بھی آپ نے

[illegible]

ہاتھ میں ہوتی تھی۔ گیارہ بیویاں تھیں۔ ان کے حقوق بھی ادا کرتے۔ پھر بیٹیاں اور نواسے نواسیاں بھی تھیں، ان کا دھیان بھی فرماتے۔ اس قدر مصروفیت کے باوجود آپ اُم ایمن کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے۔

پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو اندازہ کیجئے کہ ایک خلیفہ کی کتنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اڑھائی سالہ خلافت کا عرصہ سخت مشکلات پر مشتمل ہے کیونکہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، مدعیانِ نبوت نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا، بہت سے لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور آپ کو ان سب سے جہاد کرنا پڑا تھا۔ اس قدر مصروفیات کے باوجود آپ وقت نکال کر اُم ایمن کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی زیارت کے لئے جانا خود مستقل ایک سنت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام کے پاس جانا:

اسی باب میں علامہ نووی رحمہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ بھی اشارۃً ذکر فرمایا ہے۔ یہ قصہ قرآنِ حکیم[1] اور احادیث میں تفصیل سے مذکور ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے بتایا کہ ایک بندہ ایسا ہے کہ اس کو آپ سے بھی زیادہ علم ملا ہوا ہے تو انہیں ان کے پاس جانے کا شوق پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ علامتیں بتائیں کہ ان کے پیش آنے پر خضر (علیہ السلام) سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ مشقتیں برداشت

[1] سورۃ الکہف: ۶۰ تا ۸۲

کر کے تلاش کرتے ہوئے ان کی خدمت میں پہنچے اور ان سے عرض کیا کہ

"آپ مجھے سکھائیں وہ باتیں جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکھائی گئی ہیں۔"

دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے مگر ان کو بھی یہ حرص تھی کہ جہاں مجھے مزید علم ملے، وہاں جاؤں۔ چنانچہ اتنا لمبا سفر کر کے حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ علماء کرام اور اللہ والوں کی صحبت کو بہت بڑی نعمت سمجھ کر اختیار کرنا چاہئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کی گئی ہدایت:

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی گئی۔

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ (الکہف: ۲۸)

"اور جو لوگ صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں ان کے ساتھ اپنے آپ کو ٹھہراؤ۔"

اس آیت مبارکہ میں آپ سے فرمایا گیا کہ آپ اللہ والوں کے ساتھ رہیں حالانکہ آپ سے بڑھ کر کون اللہ والا ہوگا۔ اس سے اندازہ لگتا ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنا کتنی ضروری چیز ہے۔

فرشتے کے ذریعے خوشخبری:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی

اللہ والے کی زیارت کے لئے کسی دوسرے گاؤں کا سفر اختیار کیا۔ اللہ والا دوسرے
گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ اس کی خدمت میں حاضری کے لئے چلا تو اللہ تعالیٰ نے اس
کے راستے میں ایک فرشتے کو مقرر کر دیا۔ چنانچہ راستے میں فرشتے کی اس سے
ملاقات ہوئی۔ اس نے اس آدمی سے پوچھا کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ اس نے
جواب دیا کہ میرا بھائی فلاں گاؤں میں رہتا ہے۔ میں اس سے ملنے کے لئے جا رہا
ہوں۔ فرشتے نے پوچھا کہ کیا تمہاری کوئی چیز یا مال اس کے پاس رکھا ہوا۔ جس کے
لئے تم وہاں جا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں، صرف اتنی بات ہے کہ میں اس
کے ساتھ اللہ کے لئے محبت کرتا ہوں۔ چونکہ مجھے اللہ سے محبت ہے اور وہ بھی اللہ والا
ہے تو مجھے اس سے بھی محبت ہے۔

یہ سن کر فرشتہ بولا کہ خوب سن لو! میں تمہاری طرف اللہ کا قاصد بن کر آیا
ہوں اور اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہارے پاس یہ پیغام بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے
ایسے ہی محبت کرتا ہے جیسے تم اس سے محبت کرتے ہو۔ (مسلم بحوالہ ریاض الصالحین ص ۱۷۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ والوں سے اللہ کے لئے محبت کرتا ہے۔
اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمانے لگتے ہیں۔

اچھے اور برے ساتھی کی مثال:

ایک حدیث مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے ہم نشین اور
برے ہم نشین کی مثال بتائی۔ فرمایا کہ اچھے ساتھی کی مثال اس شخص کی سی ہے جس
نے ہاتھ میں مشک اٹھا رکھی ہے اور برے ساتھی کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو
بھٹی والا ہوتا ہے۔

لوہار اپنی بھٹی کو دہکانے اور لوہے کو تپانے کے لئے مشکیزے کی طرح ایک

چیز ہوتی تھی جسے وہ دباتے تھے اس سے ہوا نکلتی تھی جس سے آگ بڑھتی تھی اور اس کے نیچے میں لوہا پگھلتا تھا۔ اسے "کیر" کہتے تھے۔ اردو میں اسے دھونکنی کہتے ہیں۔ آج کل اس کی جگہ موٹروں اور طرح طرح کے آلات نے لے لی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مشک اٹھانے والا یا تو تمہیں کچھ مشک مفت دے دے گا یا اس سے تم کچھ خرید لو گے اور اگر اور کچھ نہیں تو پاس رہنے کی وجہ سے تمہیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی خوشبو تم تک پہنچے گی۔ ان ساری صورتوں میں تمہیں فائدہ ہوگا۔

اور وہ شخص جو دھونکنی دہکا رہا ہے وہ یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا۔ (کوئی چنگاری اڑے گی جس سے کپڑے جل جائیں گے) یا اس کی وجہ سے تمہیں بدبو آئے گی (بخاری و مسلم)۔ خلاصہ یہ کہ اس کے پاس بیٹھنا نقصان سے خالی نہیں۔

سچوں کے ساتھ رہو:

مراد یہ کہ برے ساتھی سے ضرور نقصان پہنچے گا اور اچھے ساتھی سے فائدہ ضرور پہنچے گا۔ لہٰذا انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اچھے لوگوں کے ساتھ رہے۔ اسی بات کو قرآن مجید میں یوں فرمایا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

[التوبۃ: ۱۱۹]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ساتھ رہو۔''

یعنی وہ لوگ جو دل، عمل اور زبان کے سچے لوگ ہیں ان کے ساتھ رہو۔ اور ایسے سچے اللہ والے ہیں۔

دلی محبت کن سے ہونی چاہیے؟

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں

﴿لَا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ﴾ (رواہ ابوداؤد و ترمذی)

"تم صحبت اختیار نہ کرو مگر مومن کی اور تمہارا کھانا نہ کھائے مگر متقی پرہیزگار۔"

یعنی اگر ساتھی بنانا ہو تو مومن کو بناؤ۔ کافروں کے ساتھ معاملات وغیرہ کرنا تو اگرچہ جائز ہے۔ یہاں پر دوستی اور دلی محبت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ تعلق صرف ایمان والوں سے ہو۔ اسی طرح کافر کو کھانا کھلانا بھی جائز ہے لیکن یہاں پر بھی یہی مراد ہے کہ تمہارے اچھے تعلقات متقی پرہیزگار لوگوں سے ہوں۔ وہ تمہارے ہاں آئیں اور کھانا بھی کھائیں۔ اگر تعلقات فاسق و فاجر لوگوں سے ہوں گے تو کھانا کھانے میں بھی وہی لوگ پاس بیٹھیں گے۔ اس کا نقصان یہ ہوگا کہ ان کی بری حسنات تمہارے اندر منتقل ہو جائیں گی۔

اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقع پر اس طرح ارشاد فرمایا۔

﴿اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ﴾

"آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک دیکھ لیا کرے کہ وہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔"

جس سے محبت، اسی کے ساتھ حشر:

اللہ والوں اور بزرگوں سے محبت کرنے کی ایک عظیم فضیلت وہ ہے جو ایک حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آدمی کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے لیکن ان کے درجے تک نہیں ہوتا (مثلاً علم میں ان کے برابر نہیں یا تقویٰ اور بزرگی میں ان کے برابر نہیں۔ خود بڑا عالم یا کوئی بزرگ نہیں لیکن اہل علم اور اہل تقویٰ سے محبت کرتا ہے) تو اس کا حکم ہے۔

آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ﴾ (بخاری و مسلم)

''آدمی انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہے۔''

دنیا میں عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے آدمی کو محبت ہوتی ہے، انہی کے ساتھ اس کا دل لگتا ہے، انہی کے پاس باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ اسے ایسے ہی لوگوں کے ساتھ رکھے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے لیکن اس کا اپنا عمل ایسا نہیں ہے جو ان کی برابری کر سکے۔ (گویا اللہ والوں سے محبت تو ہے لیکن عمل میں کمی ہے) ایسے آدمی کا کیا حکم ہے؟

آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ﴾

''آدمی ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ اسے محبت ہے۔''

دنیا میں تو ان کے ساتھ تھا یعنی کہ ان سے ملتا جلتا تھا، آخرت میں بھی انہی کے ساتھ ہوگا۔

یہ بہت بڑی بشارت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ والوں سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں اور دنیا کے اندر وہ ان کے ساتھ رہنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

ایک دیہاتی صحابی کا واقعہ:

ایک مرتبہ ایک دیہاتی عربی (بدو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے حکیمانہ انداز میں اس سے پوچھا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟

حکمت کی بات یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ میں نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے۔ اعمال میں کس قدر بہتری پیدا کی ہے۔ کوئی نماز تو ذمہ میں نہیں ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی تو باقی نہیں ہے۔ کسی رمضان کے روزے تو قضا نہیں ہوئے۔ حقوق العباد ادا ہو رہے ہیں یا نہیں؟ جو فرائض اور ذمہ داریاں شرعاً لازم ہیں، وہ پوری ہوئی ہیں یا نہیں۔ بنیادی طور پر غور کرنے کی بات یہی ہے۔ قیامت کے آنے کے بارے میں سوال کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔ اس لئے آپ نے اسے اصل بات کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے یہ سوال کیا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے۔

اس نے بھی خوب جواب دیا۔ کہا کہ اور تو کچھ تیار نہیں کیا، صرف اتنی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ (آخرت کے لئے میری یہی تیاری ہے)۔

آپ نے اسے خوشخبری سناتے ہوئے فرمایا:

﴿انت مع من احببت﴾ (بخاری ۲/۹۱۱)

"تو آخرت میں انہی کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ تو محبت کرتا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا:

اللہ والوں سے محبت کرنے کی اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ یہ دعا کرتے تھے:

﴿اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَ حُبَّ عَمَلٍ یُقَرِّبُنِیْ اِلٰی حُبِّکَ﴾

"اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں اور ان لوگوں کی محبت مانگتا ہوں جو آپ سے محبت کرتے ہیں اور ایسے عمل کی محبت مانگتا ہوں جس عمل سے میرے اندر آپ کی محبت اور بڑھ جائے۔"

جبرائیل امین کے آنے کے بارے رسول اللہ ﷺ کی خواہش:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل امین سے فرمایا

﴿ما یمنعک ان تزورنا اکثر مما تزورنا﴾

"آپ جتنی بار ہم سے ملنے کے لئے آتے ہیں، اس سے زیادہ کیوں نہیں۔"

حضرت جبرائیل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وحی لے کر

حاضر ہوتے تھے جو بھی قرآن مجید کی آیت کی صورت میں ہوتی تھی اور کبھی قرآن مجید کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اور ہدایت لے کر آتے تو ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اور زیادہ آیا کریں۔

آپ کی اس خواہش کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ (مریم ۶۴)

"(جبرائیل نے عرض کیا) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم کے ساتھ، جو کچھ ہے ہمارے آگے، پیچھے اور درمیان، سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ یہاں آنے میں ہماری اپنی کوئی قدرت اور اختیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، ہم حاضر ہوتے ہیں، نہیں ہوتا تو نہیں آ سکتے۔

(بخاری بحوالہ ریاض الصالحین ۱۷۰)

بہرحال! اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ جبرائیل اتنی اور زیادہ آیا کریں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ جبرائیل امین اللہ رب العزت کے مقرب بندے اور فرشتے ہیں۔ اور اللہ کے مقربین سے تعلق رکھنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلرَّجُلُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ﴾ (رواہ ابوداؤد والترمذی و... بحوالہ ریاض الصالحین ۱۷۱)

"آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے پس تم میں کا ہر آدمی دیکھ لیا کرے اس کو جس سے وہ دوستی کر رہا ہے۔"

صحبت کے اثرات ضرور پڑتے ہیں:

اس حدیث مبارک میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی سے دوستی کرنے سے پہلے اس شخص کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے۔ اگر اچھا ہے تو اس سے دوستی کرنی چاہیے اور اگر برا تو اس کی دوستی سے بچنا چاہیے، کیونکہ ایک دوست کے اخلاق و عادات کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔

اگر آپ کسی برے آدمی سے دوستی کریں گے تو اگرچہ آپ کا ارادہ اس کی بری عادتیں اختیار کرنے کا نہ ہو اور آپ اس کے لئے کوشش بھی کریں لیکن رفتہ رفتہ اس کی صحبت کے اثرات آپ پر ضرور آئیں گے اور آپ کے اندر وہ عادات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی جو اس کے اندر ہیں۔

بہت سے لوگ کہا کرتے ہیں کہ آدمی کو خود مضبوط ہونا چاہئے۔ اگر وہ خود مضبوط ہوگا تو کسی بھی ماحول میں جائے اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ یہ بات بالکل غلط اور تجربات کے خلاف ہے۔ رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے آدمی کے اخلاق و عادات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اگرچہ شروع شروع محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً آدمی غلط لوگوں کے پاس گیا۔ ایک مجلس میں ان کے ساتھ رہا۔ اپنے آپ کو مضبوط رکھا، کوئی گناہ کا کام نہیں کیا، کوئی بری بات نہیں کی۔ لیکن اگر اس نے ان کے پاس آنا جانا رکھا تو بہت ہی معمولی رفتار سے انکا اثر شروع ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ اثر بڑھتا چلا جاتا ہے اور آدمی کو اس وقت محسوس ہوتا ہے جب وہ بہت زیادہ تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔

ریل کے کانٹے کا فرق شروع میں معمولی ہوتا ہے

اس کی مثال حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ یہ دیا کرتے تھے کہ آپ نے

دیکھا ہوگا کہ ریلوے کی لائنیں جہاں سے مڑتی ہیں اور ان کا کانٹا بدلا جاتا ہے تو شروع شروع میں سیدھی لائن اور بدلی جانے والی لائن میں صرف ایک انچ کا فرق ہوتا ہے۔ پھر ڈیڑھ انچ کا، پھر دو انچ کا، دو تین منٹ کے یہ فرق فٹوں (Foots) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پانچ چھ منٹ کے بعد دونوں کا رخ بالکل واضح طور پر جدا ہو جاتا ہے۔ کوئی نسبت باقی نہیں رہتی۔ یہی اثر صحبت کا ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد بالکل واضح تبدیلی آجاتی ہے۔ جس کو دوسرے لوگ بھی محسوس کرتے ہیں اور خود انسان کو اس کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

مالداروں کی صحبت میں رہنے کے اثرات

اس کو ایک اور مثال سے سمجھیں۔ بعض لوگ جو سیدھے سادھے ماحول میں رہتے ہیں کہ ان کے ہاں نہ رنگینی ہے، نہ ٹیپ ٹاپ ہے، نہ دکھاوا ہے، نہ مال و دولت کی دوڑ ہے۔ وہاں بڑے آرام سے رہ رہے ہیں۔ اب ان میں سے کوئی آدمی مالداروں کے ساتھ رہنے لگا۔ روزانہ کروڑ پتی لوگوں سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ کبھی وہ آ رہے ہیں، کبھی یہ جا رہے ہیں، کبھی دعوت ہے، کبھی کوئی تقریب میں شرکت ہے۔ مردوں کے آنے جانے سے عورتوں کا بھی آنا جانا شروع ہو گیا، پھر بچے بھی آنے جانے شروع ہو گئے دوستیاں ہو گئیں۔

آپ دو سال بعد دیکھیں گے کہ اس گھرانے کے مزاج میں فرق پڑ گیا ہوگا۔ مردوں کے مزاج میں بھی فرق آ گیا ہوگیا، عورتوں کے مزاج میں فرق پڑ گیا ہوگا اور بچوں کے مزاج میں بھی تبدیلی آ گئی ہوگی۔ پہلے روپے پیسے کی طرف دھیان کم ہوتا تھا اب اس طرف دھیان ہونے لگے گا۔ پہلے اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ہماری گاڑی کونسے ماڈل کی ہے، اب اس کا دھیان ہونے لگے گا۔ اب یہ بھی دھیان

ہوگا کہ فریج، اے سی وغیرہ کی قیمتیں کیا ہیں کیونکہ ایسی مجلسوں میں یہی گفتگو ہوتی ہے جس کے نتیجے میں یہی سوچ دماغ میں آنے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ مزاج بدل جاتا ہے۔

اب امیروں سے ملنے میں مزا آتا ہے، غریبوں سے ملنے میں مزا نہیں آتا کیونکہ غریب لوگ اب اس کی نظروں میں بہت گھٹیا لوگ بن چکے ہیں۔ مالداروں کی عزت بڑھ جاتی ہے اور غریبوں کی محبت اور عزت دل سے نکل جاتی ہے۔ یہ ہمارے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں۔ آپ کو بھی جگہ جگہ اس کے اثرات نظر آئیں گے۔ لہذا اگر ایسے لوگوں سے محبت ہوگی جو مال سے محبت رکھتے ہوں گے تو آپ کے دل میں بھی مال کی محبت پیدا ہو جائے گی اور اگر ایسے لوگوں سے تعلق ہوگا جن کا مال کی طرف زیادہ التفات نہیں تو آپ کا انداز بھی وہی رہے گا۔ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بری صحبت کا ادنیٰ اثر:

اور پھر ایک بات یہ ہے کہ برے لوگوں سے دوستی کرنے کا ایک ادنیٰ اثر یہ ہے کہ جس گناہ میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں، دوسری تیسری ملاقات ہی میں اس گناہ سے نفرت میں کچھ نہ کچھ کمی آجائے گی اور پھر رفتہ رفتہ اس گناہ سے نفرت بھی ختم ہو جائے گی۔

صالحین کی صحبت اختیار کرنے کا حکم:

اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوستی کرنے سے پہلے اس شخص کو دیکھ لو کہ وہ کیسا ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے صالحین کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (التوبہ ۱۱۹)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔"

معلوم ہوا کہ اللہ والوں کے ساتھ رہنے کے بہت سے فضائل تو وہ ہیں جو پیچھے بیان ہوئے اور ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کے اخلاق و عادات کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں اللہ والوں کی صحبت کو غنیمت سمجھ کر اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ٥

ہر نعمت ایک آزمائش

موضوع: بدعت ایک آزمائش

خطاب: حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

مقام: جامع مسجد دارالعلوم کراچی

ترتیب و اقتباسات: مولانا [illegible] (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی)

باہتمام: محمد ناظم اشرف

ہر نعمت ایک آزمائش

خطبہ مسنونہ:

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّي عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. أَمَّا بَعْدُ! عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ "مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً هِيَ أَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ" (مشکوٰۃ، کتاب النکاح)

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "دِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهٗ فِيْ رَقَبَةٍ وَدِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰى مِسْكِيْنٍ وَدِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهٗ عَلٰى أَهْلِكَ أَعْظَمُهَا أَجْرًا الَّذِيْ أَنْفَقْتَهٗ عَلٰى أَهْلِكَ.

(صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک)

حدیث کا مفہوم:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے اپنے بعد کوئی فتنہ ایسا نہیں چھوڑا جو مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ خطرناک ہو۔ مراد یہ ہے کہ عورتوں کا فتنہ مردوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہے۔ اس سے زیادہ ضرر رساں کوئی اور فتنہ مردوں کے لئے نہیں۔

"فتنہ" کسے کہتے ہیں:

عربی میں فتنہ کہتے ہیں "آزمائش" کو۔ ہر وہ چیز جس کے ذریعے کسی کا امتحان لیا جائے، وہ اس کے لئے "فتنہ" ہے۔ دنیا خود فتنہ ہے۔ مال و دولت فتنہ ہے۔ اولاد فتنہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (التغابن: ۱۵)

"تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ ہے۔"

فتنہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ حرام اور ناجائز ہیں اور ان سے بچنا ضروری ہے بلکہ یہ تو رب العالمین کی عظیم نعمتیں ہیں۔ مال بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اولاد بھی۔ بلکہ قرآن مجید میں ایک جگہ مال کو "خیر" کہا گیا ہے۔[1]

ان کے فتنہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں تمہارے لئے امتحان و آزمائش ہیں۔ ان کی قدر کرو۔ ان کے حقوق ادا کرو۔ ان کی حفاظت کرو لیکن ان کی محبت کو شریعت کے تابع کرو۔ عام طور پر انسان کے دل میں ان چیزوں کی محبت بہت ہوتی ہے اگر یہ محبت شرعی حدود میں رہے اور شریعت کے تقاضوں کے تابع

۱۔ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (العادیات)

اولاد کی تمنائیں کس طرح کرتے ہیں۔ اور جن کو مل گئی ان سے پوچھئے کہ وہ کس قدر خوش ہوتے ہیں۔ بچوں کو دیکھنے سے ان کی جان میں جان آتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے بہت محبت کیا کرتے تھے:

اللہ رب العزت نے ماں باپ کے دلوں میں اولاد کی محبت رکھی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ خطبہ دے رہے تھے۔ دیکھا کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ خطبہ چھوڑ کر اترے اور ان دونوں کو گود میں بٹھا لیا۔ صحابہ کرام اور اہل خانہ بچوں سے آپ کی محبت کے معاملے کو جانتے تھے۔ چنانچہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو آپ کے استقبال کے لئے بچوں کو لے کر آتے تھے۔ اور اس میں زیادہ اپنے خاندان کے بچے ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ ان بچوں میں سے ایک دو کو سواری پر اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔ سوار ہونے والے بچے کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی تھی۔

اولاد کے ذریعے ہونے والی آزمائشیں:

تو اولاد بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن یہ آزمائش بھی ہے۔ یہاں بھی سب سے پہلی آزمائش یہ ہے کہ اس اولاد کے آنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتا ہے یا نہیں کرتا۔

دوسرا یہ کہ اولاد کی محبت میں کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنا وہ وقت جو اس کا اللہ رب العزت کے لئے تھا، اسے اولاد میں لگا دیا۔ اذان ہو گئی۔ اس سے پہلے بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ سب عبادت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے لیکن اذان

ہونے کے بعد آزمائش آئی کہ اب بچوں سے کھیلنا چھوڑ کر مسجد میں جاتے ہیں یا نہیں۔

امہات المؤمنین بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوتے تو عام مردوں کی طرح ہمارے ساتھ باتیں کرتے، ہنسی مذاق فرماتے، ہمارے کاموں میں شریک ہوتے لیکن جب اذان ہوتی تھی تو ایسے گذرے چلے جاتے تھے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہیں۔

تیسری آزمائش یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی ہدایات کے مقابلے میں بچوں کی خواہشات کو ترجیح تو نہیں دیتا۔ لڑکیاں بڑی ہوچکی ہیں اور پردے کے قائل ہیں لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں بے پردہ پھراؤ تو اب دیکھا جائے گا کہ یہ بچوں کی بات مانتا ہے یا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔

عورت ایک نعمت:

اسی طریقہ سے عورتیں اللہ رب العالمین کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ سب سے پہلی نعمت جو انسان کو اس دنیا میں آنے کے بعد ملتی ہے اور بچہ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے جسے دیکھتا ہے، وہ اس کی ماں ہوتی ہے، ماں بھی عورت ہی ہے۔ ماں کا مقام اتنا اونچا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿الجَنَّةُ تَحتَ أقدَامِ الأُمَّهَاتِ﴾[1]

"جنت ماؤں کے قدموں تلے ہیں"

ماں ایک آزمائش ہے:

لیکن ماں آزمائش بھی ہے۔ ایک طرف بوڑھی ماں ہوتی ہے اور دوسری

---

[1] اس حدیث کے الفاظ کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن معنی یہ روایت درست ہے کیونکہ اس مفہوم کی تائید میں کئی صحیح روایات منقول ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے تذکرۃ الموضوعات ص ۲۰۲، کشف الخفاء [illegible] ([illegible])

طرف بیوی بچے اور زندگی کے دوسرے بہت سے مشاغل۔ اب امتحان ہوتا ہے کہ ان مشاغل اور بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے اپنی بوڑھی ماں کی کتنی خدمت کرتا ہے۔ بیوی بچوں کی محبت میں مغلوب ہو کر ماں سے غافل تو نہیں ہو جاتا۔

بیوی بھی آزمائش:

اسی طرح بیوی اللہ رب العالمین کی بڑی عظیم الشان نعمت ہے۔ حدیث میں ہے کہ ”دنیا کے سامانوں میں سب سے بہتر سامان اچھی بیوی ہے“۔ (مشکوٰۃ، کتاب النکاح) بیوی اچھی مل جائے تو وہ دنیا کی ترقی کا بھی ذریعہ بن جاتی ہے اور آخرت کی کامیابی کا۔ لیکن بہت بڑی آزمائش بھی ہے۔ قدرتی طور پر آدمی کو بیوی سے محبت ہوتی ہے بلکہ مردانہ جذبے کی وجہ سے مرد اس کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی محبت میں مغلوب ہو کر بہت سے لوگ کتنے بڑے بڑے گناہ کر بیٹھے، کتنے بڑے بڑے جرائم میں مبتلا ہو گئے۔ اور کتنے ہی لوگوں نے اس محبت کو اعتدال میں رکھا۔ عورتوں کے حقوق بھی ادا کئے اور ماں باپ کے بھی، بہن بھائیوں کے حقوق بھی ادا کئے اور اولاد کے بھی۔ ان سب کے علاوہ اللہ رب العالمین کے حقوق بھی ادا کئے تو انہوں نے جنت کمائی۔

سب سے بڑی آزمائش:

اگرچہ ذکر کردہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمت اور آزمائش ہیں لیکن حدیث کے مطابق مردوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک آزمائش عورتیں ہیں۔ آدمی جب بالغ ہوتا ہے تو اس کے دل میں عورت کے بارے میں ایک میلان پیدا ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے نامحرم عورتیں نامحرم مردوں کے لئے آزمائش ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ

نامحرم عورت کو دیکھیں۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اپنی نظروں کو جھکالو۔

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (النور ۳۰)

''مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں۔''

نفس کہتا ہے کہ نامحرم عورت سے باتیں کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کا حکم یہ ہے کہ بے ضرورت بات نہ کرو (ہاں ضرورت پیش آجائے تو اس کی گنجائش ہے) نفس کہتا ہے کہ اس کی باتیں سنو، اس کے گانے سنو لیکن شریعت اس سے منع کرتی ہے۔ نفس کہتا ہے اس سے ہاتھ ملاؤ لیکن شریعت اس سے روکتی ہے۔ ہر قدم پر آزمائش ہے۔

آج کل یہ آزمائش اور بڑھ گئی ہے:

آج کل تو یہ آزمائش اور زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ معاشرے میں بے پردگی پھیلی ہوئی ہے۔ عورتیں بناؤ سنگھار کر کے تقریباً ننگے سر، ننگے بدن، گردن کھلی ہوئی، بانہیں کھلی ہوئیں بازاروں میں پھر رہی ہیں۔ اور اپنے اس ناجائز عمل سے دعوت گناہ دیتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آنکھ بھی زنا کرتی ہے، ہاتھ بھی زنا کرتے ہیں۔

آنکھ کا زنا یہ ہے کہ اس سے نامحرم عورتوں کو دیکھا جائے۔ ہاتھ کا زنا یہ ہے کہ اس سے نامحرم عورتوں کو چھوا جائے۔ اس موقع پر انسان زبردست آزمائش کا شکار ہوتا ہے۔

حقوق کی ادائیگی میں آزمائش:

عورت کے ساتھ انسان کو ہر وقت واسطہ رہتا ہے۔ گھر میں ہے تو بیوی کے ساتھ ہے، ماں کے ساتھ ہے، بیٹیوں کے ساتھ ہے اور بہنوں کے ساتھ ہے۔ ان

میں سے ہر ایک کی محبت اپنے درجے میں دل کے اندر ہوتی ہے۔ اس محبت کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں اور ان کے حقوق بھی ہوتے ہیں۔ ان حقوق کی ادائیگی میں بھی بہت بڑی آزمائش ہے۔ ان حقوق کی ادائیگی میں کمی کریں گے، تب بھی بہت بڑی پکڑ ہے اور اگر کسی کے حقوق ادا کرنے میں اتنی زیادتی کریں گے کہ دوسروں کے حقوق مارے جائیں تو تب بھی مواخذہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے بہت محبت فرماتے تھے لیکن ہر ایک کی محبت اس کی جگہ پر تھی۔ توازن اور اعتدال کا معاملہ تھا۔ کسی ایک کی محبت کی وجہ سے دوسرے کے حقوق تلف نہیں ہوتے تھے۔

مال خرچ کرنے میں آزمائش:

محبت کے علاوہ بیوی بچوں پر مال خرچ کرنے میں بھی بہت آزمائش ہے۔ بعض لوگ اہل وعیال پر خرچ کرنے کو دنیا کا کام سمجھتے ہیں، دین کا اور ثواب کا کام نہیں سمجھتے اس کے برعکس بہت سے لوگ اسی عمل کو کافی سمجھتے ہیں اور دن رات ایک کر کے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہو جاتی ہے۔

بیوی بچوں پر خرچ کرنے کی فضیلت:

چنانچہ اس کے بعد ان احادیث کا بیان ہو رہا ہے۔ جن میں اہل وعیال پر خرچ کرنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ رَقَبَةٍ

دِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَهُ عَلٰى مِسْكِيْنٍ وَ دِيْنَارٌ عَلٰى اَهْلِهٖ، اَعْظَمُهُمَا اَجْرًا الَّذِيْ اَنْفَقْتَهُ عَلٰى اَهْلِهٖ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ)

''وہ دینار جسے اللہ کے راستے میں خرچ کیا، وہ دینار جو غلام میں خرچ کیا، وہ دینار جو کسی مسکین پر خرچ کیا اور وہ دینار جو تم اپنے گھر والوں پر خرچ کرتے ہو۔ ان سب میں فضیلت کے اعتبار سے وہ دینار بڑھا ہوا ہے جو گھر والوں پر خرچ کیا گیا۔''

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا مطلب ہے کسی دینی کام میں خرچ کرنا جیسے جہاد میں، تبلیغ میں اور مدارس کے لئے دینا وغیرہ۔ غلام میں خرچ کرنے کا مطلب ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کرنا۔ آج کل غلام نہیں پائے جاتے پہلے زمانے میں ہوتے تھے۔ ایک انسان کو غلامی سے آزادی دلوا دینا بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ احادیث کے اندر اس کے متعدد فضائل آئے ہیں۔

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار قسم کے خرچوں کا ذکر فرمایا۔

۱۔　اللہ کے راستے میں۔

۲۔　غلام کو آزاد کرنے میں۔

۳۔　کسی مسکین کی حاجت روائی کے لئے۔

۴۔　اپنے اہل و عیال پر کیا گیا خرچہ۔

لیکن ان سب کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرمایا کہ سب سے زیادہ ثواب اس خرچے کا ہے جو آدمی اپنے گھر والوں پر کرے۔ اگرچہ پہلے تین مصارف بھی عظیم الشان ہیں اور ان پر خرچ کرنے کے بے حد فضائل ہیں لیکن ان سب میں زیادہ اجر و ثواب اس خرچ میں ہے جو اپنے گھر والوں پر ہو۔

حاجت مند والدین اور بہن بھائی بھی زیر کفالت افراد میں شامل ہیں

آدمی کا ویسے بھی تو جی چاہتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے۔ والدین اگر حاجت مند ہیں تو ان کا خرچ بھی اہل وعیال کے خرچ میں داخل ہیں۔ اور اگر بہن بھائی غریب ہیں تو ان پر خرچ کرنا بھی زیر کفالت افراد پر خرچ کرنے میں شامل ہے۔ یہ خرچ کرنا اتنا عظیم ہے کہ باقی تمام قسم کے خرچوں سے افضل ہے۔

ہمارے ایک دوست کا واقعہ:

عام طور پر لوگوں کا دھیان اس طرف بہت کم جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں، ملک سے باہر رہتے ہیں، سرجن ہیں۔ اچھی آمدنی ہے۔ سال میں ایک دو مرتبہ یہاں آتے ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا گھر میں نزاع ہوتا تھا ان کی بیوی اور بچی وغیرہ مطالبہ کرتی ہیں کہ ہمیں جوڑا بنوا دو تو کہتے کہ میں نے تمہارے چار چار جوڑے بنوائے ہیں۔ ایک عیدالفطر کا، ایک عیدالاضحیٰ کا، ایک گرمی میں اور ایک سردی میں۔ اس سے زیادہ نہیں بنوا کر دوں گا۔ حالانکہ ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے اپنے بیٹے کو ایک اور ملک میں تعلیم کے لئے بھیج رکھا ہے۔ اسے ایک متعین رقم دیتا ہوں اور اس سے کہہ رکھا ہے کہ اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔

میں نے پوچھا کہ آپ خرچ میں تنگی کیوں کرتے ہیں، کہنے لگے کہ میں بہت سے دینی کاموں میں خرچ کرتا ہوں۔ تبلیغ کے کام میں، مسجد و مدرسے میں، صدقہ و خیرات میں، علماء کی خدمت وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا: بندۂ خدا! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ بیوی بچوں کو تنگی میں رکھ کر اور پیسے بچا کر دوسری جگہ خرچ کر رہے ہو، اس میں

تمہارا ثواب کم ہے۔ ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ چونکہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اس لئے مان تو گئے لیکن ان کا دل اس بات پر مطمئن نہیں ہوا۔ وہ میرے لئے تحفہ لائے۔ میں نے کہا کہ مجھے تحفہ دینے کے بجائے زیادہ ثواب اس میں ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو تحفہ لا کر دو۔ کہنے لگے کہ میں اپنے بیوی بچوں پر ان کی ضرورت کے مطابق تو خرچ کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ عرف اور رواج کے مطابق تمہاری بیوی کے معیار کی عورتیں جس قسم کا لباس پہنتی ہیں اور جس طرح کا کھانا پینا ان کا ہے، اس کے حساب سے تمہیں خرچ دینا چاہئے۔ کچھ تو عورتوں کا مزاج حد سے گزرا ہوا ہے، اس کی تو پیروی نہیں کی جائے گی لیکن اعتدال کے ساتھ انہیں مناسب خرچ دینا چاہیے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں مال دے تو اس کا اثر تم پر ظاہر ہونا چاہئے۔ ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے کھانے پینے پر بھی ظاہر ہو، تمہارے لباس میں بھی ظاہر ہو اور تمہارے بیوی بچوں پر بھی ظاہر ہو، ورنہ ناشکری کی بات سمجھی جائے گی کہ خدا تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے لیکن تمہارے بچوں کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھے کہ یہ یتیم ہیں یا کسی غریب کے بچے ہیں۔

انہوں نے اوپرے دل سے میری بات مان لی لیکن کہنے لگے کہ آپ اس سلسلے میں کچھ احادیث لکھ دیجئے۔ تو میں نے وعدہ کر لیا اور آپ حدیث سے متعلق احادیث کی فوٹو کاپی ان کے پاس بھیجی۔

بیوی کے منہ میں لقمہ دینا بھی ثواب:

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا

وَإِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ إِلَّا أُجِرْتَ

ہوتی ہے تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے:

﴿اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا﴾ (کنز العمال، حدیث ۱۶۰۰۹)

''اے اللہ! تو خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما۔''

بدل دنیا کا بھی ہو سکتا ہے اور آخرت کا بھی۔ دنیا کا بدل یہ ہے کہ خرچ کیا، اس کے بدلے اللہ تعالیٰ نے اور مال دے دیا یا کوئی دوسری نعمت عطا فرما دی اور آخرت کا بدل یہ ہے کہ اجر و ثواب ملے، جنت ملے۔

دوسرا فرشتہ کہتا ہے:

﴿اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا﴾ (حوالہ بالا)

''اے اللہ! مال روکنے والے کو تلف (ہلاکت) عطا فرما''

یعنی جو شخص اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا۔ واجب حقوق بھی ادا نہیں کرتا مثلاً زکوٰۃ، صدقۃ الفطر ادا نہیں کرتا، قربانی نہیں کرتا یا بیوی بچوں پر جتنا خرچ کرنا چاہیے تھا، اتنا نہیں کرتا، ماں باپ پر جتنا خرچ کرنا چاہیے تھا، اس میں کمی کرتا ہے، دوسرے زیر کفالت افراد پر خرچ کرنے میں بخل کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کنجوسی کرتا ہے تو فرشتہ اس کے لئے بددعا کرتا ہے کہ اے اللہ! اس کے مال کو تلف کر دے۔

خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا:

چنانچہ خرچ کرنے والوں کو آپ دیکھیں گے کہ ان کے مال میں برکت ہوتی ہے اور بخیلوں کے بارے میں دیکھیں گے کہ ان کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ اسی مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں اس طرح ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَنْقُصُ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ﴾

(مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر ۱۶۲۰، مسند عبدالرحمن بن عوف)

"صدقے کی وجہ سے مال کم نہیں ہوتا۔"

کمی نہ آنے کا مطلب:

بظاہر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کسی کے پاس ایک ہزار روپے ہوں اور اس میں سے سو روپے اللہ کے راستے میں خرچ کر دیئے تو سو روپے کم ہو گئے لیکن حدیث بتلا رہی ہے کہ کمی نہیں آتی۔ تو کمی نہ آنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں۔

پہلا مطلب:

پہلا مطلب یہ کہ سو روپے خرچ کئے، اللہ تعالیٰ نے کسی اور ذریعے سے اس سے زیادہ رقم دلوا دے گا یا اس سے زیادہ قیمت کی کوئی چیز دلوا دے گا۔

دوسرا مطلب:

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس نو سو روپے سے کام اتنے ہو جائیں گے جو ایک ہزار سے بھی نہ ہوتے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی شخص کا بچہ بیمار ہوا، نزلہ اور بخار کی تکلیف ہوئی۔ اس نے دس روپے کی دوائی لی جس کو کھانے سے شام کو بچہ صحت یاب ہو گیا۔ یہ تو ہوئی برکت اور بے برکتی یہ ہے کہ کسی کا بچہ بیمار ہوا اسے بھی نزلہ اور بخار تھا لیکن بیماری نے طول کھینچ لیا۔ دوائی مؤثر نہ ہوئی۔ بخار لمبا ہو گیا حتیٰ کہ ٹائیفائیڈ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس کے علاج میں ہزاروں روپے پر پانی پھر گیا۔

اللہ تعالیٰ جب برکت دیتے ہیں تو سو روپے میں دس ہزار کا کام نکال دیتے ہیں اور جب بے برکتی ہوتی ہے تو دس ہزار روپے میں سو روپے کا بھی کام نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ سوچ کر بیوی بچوں پر خرچ نہ کرنا کہ اس سے دولت میں کمی ہو جائے گی، درست نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اور عطا فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

حُب فی اللہ کے فضائل

موضوع: حب فی اللہ کے فضائل

خطاب: حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
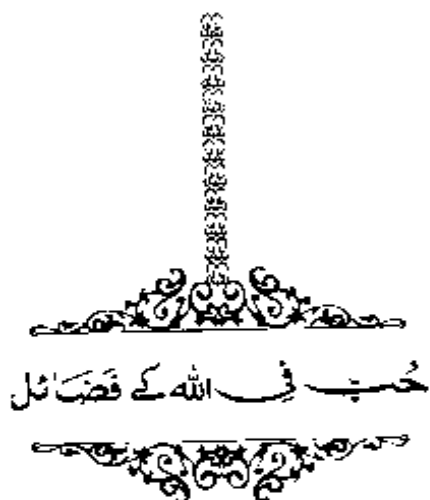
مقام: جامع مسجد دارالعلوم کراچی

تاریخ: ۷ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۶ اگست ۲۰۰۲ء

ترتیب و عنوانات: مولانا اعجاز احمد صمدانی (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی)

باہتمام: محمد ناظم اشرف

﴿حب فی اللہ کے فضائل﴾

خطبہ مسنونہ:

نحمدہٗ و نصلی علٰی رسولہ الکریم

امابعد!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ O (فتح ۲۹)

وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:

سَبْعَۃٌ یُظِلُّھُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ ظِلِّہٖ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّہٗ، اِمَامٌ عَادِلٌ وَ شَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَۃِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَ رَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰہِ اِجْتَمَعَا عَلَیْہِ وَ تَفَرَّقَا عَلَیْہِ وَرَجُلٌ دَعَتْہُ اِمْرَأَۃٌ ذَاتُ حُسْنٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ وَ رَجُلٌ

تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهٗ وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ. (متفق علیہ)

اللہ کے لئے محبت کرنا بہت بڑی عبادت ہے:

آج ایک بہت اہم باب کا آغاز ہو رہا ہے۔ جس کا عنوان ہے "بـــاب فضلِ حبّ اللّٰہ" (اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے محبت کرنے کی فضیلت)۔ اللہ کے لئے کسی سے محبت کرنا بہت بڑی عبادت اور عظیم الشان ثواب کا کام ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی بہت تاکید آئی ہے۔

صحابہ کرامؓ ایک دوسرے سے نرمی اور محبت کا سلوک کرنے والے تھے:

اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی یہ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ۝ (الفتح: ۲۹)

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔"

اس آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں تو سخت تھے لیکن آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نرمی، محبت اور ایثار کا سلوک کرنے والے تھے۔

کونسے کفار کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے؟

اتفاق سے آج رات ایک نوجوان کا فون آیا۔ اس نے کہا کہ میں امریکہ

---

[۱] یہ باب علامہ نووی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب "ریاض الصالحین" کا ہے۔

جا رہا ہوں۔ اور میں نے آپ کی فلاں کتاب میں یہ آیت (یعنی اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ... الخ) پڑھی اور اسکے متعلق مضمون بھی پڑھا۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ امریکہ میں مجھے کافروں کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے۔

میں نے اس سے کہا کہ بڑا اچھا کیا کہ آپ نے فون کر کے یہ سوال پوچھ لیا۔ ذرا سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید میں صحابہ کرام کے بارے جو یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ "کفار" کے مقابلے میں سخت ہیں۔ ان سے مراد وہ "کفار" ہیں جن سے ہماری جنگ ہو اور ان سے ہمارا صلح کا کوئی معاہدہ نہ ہو۔

اور اس سختی کا مظاہرہ میدان جنگ میں ہوتا ہے نہ کہ عام جگہوں میں۔ الحمد للہ صحابہ کرام میں یہ صفت اعلیٰ درجے میں موجود تھی کہ وہ میدان جنگ میں کفار کے مقابلے میں اتنے سخت رہے کہ انہیں سر اٹھانے نہیں دیا، یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کو ختم کر ڈالا۔

لیکن جن کافروں سے ہماری جنگ نہیں ہے، ان پر سختی کرنا جائز نہیں۔ ایسے کافروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً وہ کافر جو ہمارے ملک میں رہتے ہیں۔ ہاں اگر قانون کا تقاضا ہے تو پھر مسلمانوں پر بھی سختی ہوگی، کافروں پر بھی ہوگی، لیکن ان پر بے جا سختی کرنا جائز نہیں بلکہ ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح ان کو عبادت کی آزادی دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہم ان کو عبادت کرنے سے منع کریں۔ ان کے عبادت خانوں (مندروں، گرجوں) کو نقصان پہنچانا ہمارے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح وہ کافر جو ہمارے ملک میں نہیں، کسی دوسرے ملک میں رہتے ہیں لیکن ویزا لے کر مسلمان ملک میں آئے ہیں، ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت

ہماری ذمہ داری ہے اور انہیں بلاوجہ نقصان پہنچانا یا ان پر بلاوجہ سختی کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح اگر آپ ویزا لے کر کسی کافر ملک میں جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ وعدہ کر کے جا رہے ہیں کہ جب تک آپ کا وہاں قیام رہے گا، آپ وہاں کے قوانین کی پابندی کریں گے۔ لہٰذا اگر آپ کسی کافر ملک میں جائیں تو وہاں کے قانون کی خلاف ورزی کرنا جائز نہ ہوگا بلکہ ان کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا ان کا انسانی حق بھی ہے اور اسلام کے مکارم اخلاق میں بھی داخل ہے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میرے والد صاحب نے ایک مرتبہ اپنا یہ واقعہ خود سنایا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب ہندوستان میں انگریز کی حکومت تھی اور ابھی تک پاکستان نہیں بنا تھا۔ فرمایا کہ ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ رات بھر کا سفر تھا اور رش بھی بہت تھا۔ میرے برابر ایک بوڑھا بنیا آ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا بھی تھا، کافر بھی تھا اور کافر بھی ہندو۔ ہندوؤں کی مسلمان دشمنی تو بہت پرانی اور مشہور ہے۔

تھوڑی دیر میں جب گاڑی چل پڑی تو بنیے کو نیند آ گئی تو اس نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹیک دیا۔ اب مجھ پر دوہری مشکل پڑ گئی۔ ایک تو خود جاگنے کی اور دوسرے یہ کہ کہیں اس کی نیند خراب نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں ساکت اور ساکن بیٹھا رہا۔ بالکل ہلا جلا نہیں۔ کئی گھنٹے میں نے اسی طرح گزارے۔

دیکھئے! وہ کافر بھی تو تھا لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بھی اتنی رعایت فرمائی اس لئے کہ قرآن مجید میں الصاحب بالجنب (عارضی طور پر ساتھ بیٹھنے والے) کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور اس میں کافر و مسلم کی تخصیص نہیں کی اور یہ نہیں کہا کہ مسلمان ہو تو اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور کافر ہو تو نہ

کرو۔

کافر پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے!

اسی آیت میں یہ حکم بھی آیا ہے کہ

﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾

(سورۃ النساء: ۳۶)

"(اور نیک برتاؤ کرو) قریب کے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور کے پڑوسی کے ساتھ بھی۔"

"الجار الجنب" کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ "ایسا پڑوسی جو کافر ہو" لیکن پڑوسی ہونے کی وجہ سے آپ کے حسن سلوک کا حق دار ہو۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا

خلاصہ یہ کہ وہ کفار جن کے ساتھ ہم برسر پیکار نہیں اور ان سے ہمارا جنگ بندی کا معاہدہ ہے یا وہ ہمارے ملک میں رہتے ہیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اسلام کے مکارم اخلاق میں سے ہے۔ اسلام اسی طریقے سے ہی پھیلا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے اخلاق سے لوگوں کے دل جیتے ہیں۔ ہر جگہ تلوار سے اسلام نہیں پھیلا بلکہ اسلام تلوار سے پھیلا ہی نہیں۔ اسلام تو اپنی حقانیت کے زور اور اہل اسلام کے اسلام پر عمل کرنے کی وجہ سے پھیلا ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی رہے، اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام پر عمل کر کے دکھایا۔ حاکم بنے تو لوگوں کو بتلایا کہ مسلمان حاکم کیسا ہوتا ہے۔ محکوم ہوئے تو لوگوں کو عمل سے بتلایا کہ محکوم کیسے ہوتے ہیں۔ تاجر بنے تو سچی تجارت کر کے بتلایا کہ

مسلمان تاجر کیسا ہوتا ہے۔ شوہر ہوئے تو عمل کر کے بتایا کہ مسلمان شوہر کیسا ہوتا ہے۔ ملازمت و مزدوری کی تو دنیا کو بتایا کہ مسلمان ملازم اور مزدور کیسا دیانت دار ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کو دیکھ دیکھ کر لوگ مشرف با اسلام ہوتے چلے گئے۔ لیکن آج ہمیں دیکھ دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں کیونکہ ہماری عملی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں رہی۔

اپنے اخلاق کے ذریعے کفار کو متاثر کیجئے:

ہمارے شہر کے تاجر سب زیادہ تر دوسرے مذہب کے لوگ ہیں۔ ہندو ہیں عیسائی ہیں۔ آپ ان کے ساتھ خیرخواہی کا معاملہ کریں اور سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ حکمت اور سمجھداری کے ساتھ انہیں حق کی دعوت دیں لیکن باقاعدہ دعوت دینے سے پہلے اخلاق کے ذریعے ان کے دل جیت لیں۔ جب ان کے دلوں میں آپ کی محبت پیدا ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ آپ عظیم الشان ہیں تو پھر آپ کی بات کا اثر بھی ہوگا اور اس کا مثبت نتیجہ بھی سامنے آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی محبت اللہ کے لئے تھی:

تلاوت کردہ آیت میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحمدلی کا معاملہ کرنے والے اور کافروں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرنے والے تھے لیکن علامہ آلوسی نے یہ بات ایک اور مقام میں ذکر فرمائی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے لئے تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنوں سے اس لئے محبت کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے اور دین پر عمل کرنے والے ہیں اور کافروں سے سختی اس لئے کرتے تھے کہ وہ اللہ کے دشمن تھے۔

قرآن مجید میں انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جگہ اس طرح مدح کی گئی ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ﴾ (الحشر)

"اور وہ لوگ جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں۔"

انصار کی مہاجرین سے محبت "اللہ" کے لئے تھی:

مہاجرین کے ساتھ ان کی محبت بھی اللہ کے لئے تھی تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ انصار کا مہاجرین سے دنیا کا کیا مفاد وابستہ تھا؟ دنیا کا مفاد تو کیا وابستہ ہوتا، انہیں تو مہاجرین کے لئے بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ انصار نے مہاجر بھائیوں کے لئے ایسی بے مثال قربانیاں پیش کیں کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات یعنی برادرانہ تعلق قائم فرما کر انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ ایک انصاری کے لئے ایک مہاجر کو اس کا بھائی بنایا۔

انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو یہ پیشکش کی کہ دیکھو میرے پاس زمین ہے، آدھی تمہاری آدھی میری۔ میرا مکان ہے آدھا تمہارا آدھا میرا، میرا باغ آدھا تمہارا آدھا میرا، میرے پاس اتنا مال ہے آدھا تمہارا آدھا میرا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مہاجر غیر شادی شدہ تھا اور اس کے انصاری بھائی کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں تو اس نے اپنے مہاجر بھائی سے یہ پیشکش کی کہ میں اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں تم اس

سے شادی کرادو۔

"حب فی اللہ" سے ایمان مکمل ہوتا ہے:

انصار نے اتنا مال قربان کیا اور اس قدر قربانیاں دیں، یہ سب اللہ کے لئے محبت کی وجہ سے تھا۔ اور اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

﴿مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَ أَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ﴾

(مشکوۃ، کتاب الایمان)

"جس نے اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ کے لئے دشمنی کی تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔"

معلوم ہوا کہ "حب فی اللہ" ایسی صفت ہے کہ جس کی وجہ سے انسان کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔

سات آدمیوں کے لئے عرش کا سایہ:

اللہ کے لئے محبت کرنے کی ایک عظیم فضیلت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ،

إِمَامٌ عَادِلٌ وَ شَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَ

رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ

اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ اِمْرَأَةٌ ذَاتُ

حُسْنٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهُ وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا وَفَاضَتْ عَيْنَاهُ. (متفق علیہ)

"سات آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سائے کے نیچے ایسے روز جگہ عطا فرمائے گا جس روز اس کے سائے کے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا ایک امام عادل، دوسرا وہ جوان جو جوانی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو، تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو، چوتھے وہ دو شخص جو اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں کہ اسی پر ان کا اجتماع ہو اور اسی پر جدائی، پانچواں وہ شخص جسے حسب نسب والی خوبصورت عورت (برائی کی طرف) بلائے اور وہ کہے کہ میں اللہ رب العزت سے ڈرتا ہوں، چھٹا وہ شخص جو اس طرح صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا اور ساتواں وہ شخص جو اللہ رب العزت کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کے آنسو بہہ پڑیں۔"

یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں آئی ہے اور جو حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں آئی ہو، وہ انتہائی درجے کی قوی حدیث ہوتی ہے۔

اس حدیث میں ان سات افراد کی یہ فضیلت بیان کی گئی کہ قیامت کے روز میدان حساب میں جب اللہ تعالیٰ کے سائے کے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں رکھے گا۔ کسی اور چیز کا سایہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں نہ کوئی عمارت ہوگی اور نہ کوئی درخت ہوگا بلکہ کھلا چٹیل میدان ہوگا۔

میدانِ حشر کا حال:

اس میدانِ حساب کا حال احادیث میں یہ لکھا ہے کہ خوف اور دہشت کی وجہ سے پورے مجمع پر سناٹا چھایا ہوا ہوگا حالانکہ اربوں کھربوں انسان وہاں ہوں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جتنے انسان اس دنیا میں آئے ہوں گے، وہ سارے کے سارے انسان (مسلمان اور کافر) اس میدان میں جمع ہوں گے۔ اتنے بڑے میدان میں شور شرابا کے بجائے ایسا زبردست سناٹا ہوگا کہ اگر کوئی کھڑا ہوکر آواز دے تو سب تک اس کی آواز پہنچ جائے اور کوئی عمارت اور درخت نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو دوسرے سے رکاوٹ نہ ہوگی لہٰذا ایک شخص اگر تمام لوگوں کو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکے گا۔

احادیث میں آتا ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ ایسے غضب ناک ہوں گے کہ اس سے پہلے کبھی ایسے غضب ناک نہیں ہوئے اور نہ کبھی اس کے بعد ایسے غضب ناک ہوں گے۔ آفتاب ایسا محسوس ہوگا گویا کہ بالکل سر کے پاس آگیا ہے۔ لوگوں کا ہجوم اتنا زبردست ہوگا کہ ایک دوسرے کے اندر گھسے جارہے ہوں گے۔ اور پسینے کا حال یہ ہوگا کہ کسی کا پسینہ ٹخنوں تک ہوگا، کسی کا گھٹنوں تک، کسی کا رانوں تک، کسی کا ناف تک، کسی کا سینے تک، کسی کا گلے تک اور کسی کا منہ تک آگیا ہوگا۔ سب ننگے ہوں گے، بدن پر کوئی کپڑا نہ ہوگا۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا۔

ایسے ہولناک دن میں اللہ تعالیٰ سات قسم کے آدمیوں کو اپنے سایہ میں جگہ عطا فرمائیں گے۔ اپنے سایہ سے مراد یہ ہے کہ ایک سایہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہوگا۔ دوسرا عرشِ رحمٰن کا سایہ ہوگا۔

''مسجد میں دل اٹکا رہنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ مسجد سے باہر آتا ہے تو اسے یہ دھیان لگا رہتا ہے کہ نماز میں کتنی دیر باقی ہے۔ وہ اپنے سارے کاموں کو مسجد کے تابع کر دیتا ہے اور ان کی ترتیب اس طرح بناتا ہے کہ صحیح وقت پر مسجد میں پہنچ جائے۔

جیسا عمل ویسی جزاء۔ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کا دل دنیا کی آلائشوں سے بچا ہوا تھا، دنیا کی ناجائز چیزوں کی محبت سے اس کا دل دور تھا، اس کی محبت اللہ تعالیٰ کے گھر سے تھی، اسی کے مطابق یہ بدلہ ملے گا کہ اللہ اسے اپنا سایہ عطا فرمائیں گے۔

چوتھا شخص:

چوتھی قسم کے وہ دو شخص ہیں جو آپس میں اللہ کے لئے محبت کریں، جمع بھی اللہ ہی کے لئے ہوں اور الگ بھی اللہ کے لئے۔ ان کی محبت اور دوستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو۔

ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علماء اور بزرگوں سے جو لوگ محبت کرتے ہیں، ان کی محبت بھی اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ آدمی کسی مالدار سے محبت کرے تو اس کے بارے یہ احتمال ہے کہ دل کے کسی گوشے میں یہ حرص اور طمع رکھتا ہو کہ مجھے اس سے کوئی مالی فائدہ پہنچ جائے گا۔ کسی حاکم اور افسر سے محبت کرے تو اس میں بھی یہ امکان ہے کہ اس سے کسی دنیاوی فائدے کے لالچ کے لئے محبت کر رہا ہو لیکن اگر کوئی شخص کسی عالم دین یا کسی اللہ والے بزرگ سے محبت کر رہا ہے تو محض اس لئے کر رہا ہے کہ وہ اللہ کے دین کا علم رکھنے والا ہے یا اللہ کے دین کو لوگوں میں پھیلانے والا ہے یا اللہ کے دین پر عمل کرنے والا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ محبت اللہ

نہیں چلا۔ مطلب یہ کہ مکمل طور پر خفیہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہیں ہوئی۔

ساتواں شخص:

ساتویں قسم ان لوگوں کی ہے کہ جنہوں نے اللہ کو تنہائی میں یاد کیا اور پھر آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ اللہ کی محبت میں یا اپنے گناہوں پر ندامت کی وجہ سے اللہ کے خوف میں۔ اس کے ساتھ یہ معاملہ ہوا اور وہ تھا بھی تنہائی کی حالت میں تو اس میں ریا کا کوئی احتمال نہیں۔ اس لئے اس پر اتنی بڑی فضیلت کی خوشخبری سنائی گئی۔ اسے بھی ان سات قسم کے آدمیوں میں شمار کیا گیا جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنا خاص سایہ نصیب فرمائیں گے۔

یہ سات قسم کے افراد وہ ہیں جن کے بارے میں اس حدیث سے اللہ ﷺ فضیلت بیان کی گئی۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ محبت تو غیر اختیاری چیز ہے۔ دل انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا تو اللہ کے لئے دوسرے سے محبت کیسے پیدا ہو۔

جواب یہ ہے کہ اس کی کوشش کی جائے اور کوشش کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت بڑھائیں۔ اللہ کی محبت سے اللہ والوں کی محبت پیدا ہوگی۔ کیونکہ محبوب کا محبوب محبوب ہوا کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور کریں، اس کی صفات کمال کا دھیان کریں اور یہ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ سے محبت کرنے والوں کے ساتھ رہیں۔ اللہ والوں کے ساتھ رہنے سے اللہ کی محبت

ہو گئی اور جب اللہ کی محبت ہو گئی تو اس کے تمام لوگوں کی محبت پیدا ہوتی ہی ہے کیونکہ وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں۔

آپس میں محبت بڑھانے کا ایک اور طریقہ:

آپس میں محبت بڑھانے کا ایک اور طریقہ ”ایک دوسرے کو سلام کرنا“ ہے۔ اس کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

﴿وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَوَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ، أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ﴾

(مسلم شریف، کتاب الایمان)

”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ اور تم اس وقت تک ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں ایسا عمل نہ بتاؤں کہ جب وہ کرو تو آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو۔ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔“

”السلام علیکم“ کہنا اسلام کے شعائر میں سے ہے۔ مسلمانوں کی علامت ہے۔ قرآن و حدیث میں بھی ایک دوسرے کو سلام کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ اور یہ باہمی محبت کا ذریعہ ہے۔

سلام کے بارے میں غلط فہمیاں:

آج کل عجیب قصہ ہو گیا ہے۔ بعض لوگ مصافحہ کا تو بہت اہتمام کرتے ہیں، لیکن سلام نہیں کرتے۔ جب کوئی بزرگ آجائے تو ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر اور دھکے دے کر آگے پہنچتے ہیں اور جا کر صرف مصافحہ کرتے ہیں، سلام نہیں کرتے۔ حالانکہ احادیث میں مصافحہ کی تاکید نہیں آئی اگرچہ مصافحہ کرنا مستحب ہے لیکن سلام کرنے کی بہت زیادہ تاکید ہے۔ سلام میں ابتداء کرنا سنت مؤکدہ ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے۔

بعض لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ سلام اور مصافحہ کو لازم سمجھتے ہیں۔ ادھر سلام ادھر مصافحہ۔ جب بھی ملیں گے مصافحہ ضرور کریں گے اور خیر خیریت بھی پوچھتے ہیں۔

بعض لوگ سلام کر کے انگوٹھا بھی پکڑتے ہیں۔ انگوٹھا پکڑنے کی وجہ یہ ہے کہ جاہلوں میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے انگوٹھے میں ہڈی نہیں ہے، تو وہ چیک کرتے ہیں کہ کہیں یہ ملنے والا آدمی خضر تو نہیں ہے۔

یہ ساری جہالت کی باتیں ہیں۔ دینی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے الٹی سیدھی باتوں کو حصہ بنا لیا گیا۔

ایمان کے بعد سب سے اچھا عمل:

ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ ایمان لانے کے بعد سب سے اچھا عمل کونسا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿إِطْعَامُ الطَّعَامِ وَ إِفْشَاءُ السَّلَامِ﴾

''لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام پھیلاؤ۔''

''افشاء السلام'' کا حاصل یہ ہے کہ جو بھی ملے اسے سلام کرو۔ خواہ آپ اسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ ہر حال میں سلام کریں۔ اپنے اندر سلام کرنے کی عادت ڈالیں۔

سلام کرنے سے محبت بڑھتی ہے:

جب آپ سلام کرنے کی عادت ڈالیں گے تو اس سے آپس میں محبتیں بڑھیں گی۔ آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ مثلاً آپ کسی بس میں سوار ہوں۔ آپ ان کے لئے اور وہ آپ کے لئے اجنبی ہیں لیکن سیٹ پر بیٹھتے ہی اگر آپ نے سلام کر لیا تو فوراً دلوں میں ایک انس پیدا ہو جائے گا۔

غیر مسلم ممالک میں سلام کا ایک خاص فائدہ:

غیر مسلم ممالک میں تو اس کی بہت قدر و قیمت محسوس ہوتی ہے۔ وہاں ہمارے بہت سے مسلمان بھائی ایسے رہتے ہیں کہ ان کے لباس اور شکل و صورت سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ مسلمان ہیں یا نہیں؟ لیکن وہ ہمیں دیکھ کر پہچان لیتے ہیں۔ یورپ و امریکہ وغیرہ کے سفر میں یہ بات اکثر پیش آتی ہے کہ وہ لوگ ہمیں دیکھ کر سلام کرتے ہیں۔ اس سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سلام کرتے ہی اجنبیت دور ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے حالات و احوال معلوم کئے جاتے ہیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی تجربے کی بات ہے۔

سلام کی ایک خاص تاثیر:

سلام کی ایک خاص تاثیر یہ ہے کہ اس کی عادت سے دل میں تکبر پیدا نہیں ہوتا اور اگر پہلے سے ہو تو اسے دور کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کے دل میں تکبر نہیں ہوگا، دوسروں کو اپنے سے اچھا جانے گا اور پھر ان سے محبت کرنے لگے گا۔

غرضیکہ یہ سب طریقے راہ ہیں جن سے باہمی محبت والفت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے والا بنائے اور اس کے پیدا کرنے کے طریقوں کو اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین○

اسلام میں پُورے پُورے داخل ہو جاؤ

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ

خطبہ مسنونہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ، و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا ○ من یھدہِ اللّٰہ فلا مضل لہٗ و من یضللہٗ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و نبینا و مولانا محمداً عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ و علٰی آلہٖ و صحبہٖ اجمعین و سلم تسلیماً کثیراً کثیرا

اما بعد!

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ○

سارے اعمال بھی اسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایمان کے بغیر کوئی شخص نماز پڑھے، روزہ رکھے، زکوٰۃ دے، حج کرے یا کوئی بھی نیک عمل کرے، اللہ کے ہاں قبول نہیں۔

ایمان اگرچہ بہت بڑی دولت ہے بلکہ اس کے برابر کوئی دولت ہی نہیں۔ اس لئے کہ یہ ایمان ایسی دولت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ایمان کی دولت کو بچا کر قبر تک پہنچا دے تو اسے بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ اس کا حشر اور اس کی سزا کافروں جیسی نہیں ہوگی۔ اللہ پناہ میں رکھے، کافروں کی سزا تو یہ ہوگی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں۔ اس سے کبھی نکلیں گے ہی نہیں اور اس میں کبھی موت بھی نہیں آئے گی۔ عذاب ہی عذاب ہوگا اور عذاب بھی جہنم کا بڑا بھاری دردناک ہوگا۔

مؤمن اگرچہ کتنا ہی بدعمل اور گنہگار ہو، وہ اگر جہنم میں چلا بھی گیا تو بھی وہاں سے نکال لیا جائے گا اور بالآخر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ مؤمن کا اصل ٹھکانہ جنت ہے اور کافر کا اصلی ٹھکانہ جہنم ہے۔ تو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم سے بچ جانا کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔

عذابِ آخرت کی ایک جھلک:

ایمان کی وجہ سے ہمیشہ کے عذاب سے بچ گئے، عارضی عذاب رہ گیا لیکن وہ عارضی عذاب بھی اتنا خوفناک ہے کہ دنیا میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ آخرت کے میدان میں اعلان ہوگا کہ ایسے آدمی کو لایا جائے جس نے دنیا میں سب سے زیادہ آرام، راحت اور خوشیوں کی زندگی گزاری ہو۔ اندازہ کیجئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے آنے والے کروڑوں انسانوں میں جس شخص نے سب سے زیادہ راحت و آرام والی زندگی گزاری ہو، وہ کیسی

لذتوں راحت اور آرام والا انسان ہوگا۔ اس کو لایا جائے گا۔ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم کی فضا میں داخل کر کے نکال لاؤ، وہاں چھوڑنا نہیں ہے، صرف ڈوبا دیکر نکال لانا ہے۔

جب اُسے جہنم کی فضا میں ڈال کر واپس لایا جائے گا تو اس سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ! دنیا میں زندگی کیسی گذاری؟ وہ جواب دیگا کہ یا اللہ! میں جس عذاب سے نکل کر آیا ہوں۔ جس خوفناک منظر کو میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس کے بعد مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں ہورہا کہ راحت و آرام کس کو کہتے ہیں۔ لذت وخوشی کس چیز کا نام ہے۔ میرے رگ و پے میں عذاب ایسا سرایت کر گیا ہے کہ اب میں خوشیوں کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

چند سیکنڈ جہنم میں رہنے والے شخص کا یہ بیان ہے اور اگر کسی کو جہنم میں سال دو سال یا کئی سال تک جہنم میں رکھا جائے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اس عارضی عذاب سے بچنے کے لئے صرف ایمان لانا کافی نہیں بلکہ عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ عمل کے بغیر پوری نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس بات کو بیان کیا گیا۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَالْعَصْرِ o إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ o إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o﴾ (سورۃ العصر)

"زمانے کی قسم! بلاشبہ انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔"

یہاں آمنوا کے ساتھ "وعملوا الصالحات" کو ذکر کیا گیا اور یہ بتایا

گئے کہ اخروی خسارے سے بچنے کے لئے صرف ایمان لانا کافی نہیں بلکہ نیک اعمال کرنا انتہائی ضروری ہیں۔ اور "نیک اعمال" کا حاصل یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے، انہیں بجالائے اور جن چیزوں سے روکا ہے، ان سے رک جائے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی گناہ ہوجائے تو تہہ دل سے توبہ واستغفار کرے۔

سارے اعضاء کو اسلام میں داخل کرو:

اب آئیے! اس آیت کے مضمون کی طرف جو میں نے خطبے میں پڑھی۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ "اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ" یعنی تم نے دل سے یقین اور زبان سے اقرار کرکے ایمان تو قبول کرلیا، اب اپنے سارے اعضاء کو اسلام میں داخل کرو۔ اپنے دل کو اسلام میں داخل کرو یعنی وہ جذبات اور خیالات نہ لاؤ جو اسلام کے خلاف ہیں۔ زبان کو بھی اسلام میں داخل کرو کہ زبان کے جتنے اعمال ہیں، ان سب کو اسلام کے تابع کرو۔ آنکھوں کو بھی اسلام میں داخل کرو۔ آنکھوں سے ایسا کام نہ کرو جس سے اسلام نے منع کیا ہے۔ اپنے دماغ کو بھی اسلام میں داخل کرو، اپنے پیٹ کو بھی، اپنے ہاتھوں کو بھی، اپنے پاؤں کو، غرض سر سے لے کر پاؤں کے ناخن تک پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ دل میں تو ایمان ہو لیکن عملی زندگی میں اسلام نہ آیا ہو۔ مثلاً نماز نہیں پڑھتے یا نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ نہیں دیتے یا زکوٰۃ دیتے ہیں۔ روزہ نہیں رکھتے یا روزہ رکھتے ہیں۔ حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا یا یہ سب کچھ کرلیا لیکن دوسروں کی غیبت بھی کرتے ہیں، دھوکہ بازی بھی کرتے ہیں، حرام بھی کھاتے ہیں، کام چوری بھی کرتے ہیں، سود بھی لیتے دیتے ہیں، رشوت لیتے بھی ہیں دیتے بھی

ہیں۔ اگر یہ باتیں نہیں تو اسلام میں پورے داخل نہ ہوئے۔

گویا دل تو اسلام میں داخل ہو گیا لیکن پیٹ اسلام میں داخل نہ ہوا کہ اس میں حرام جا رہا ہے، منہ اسلام میں داخل نہیں ہوا کہ وہ حرام کھا رہا ہے، ہاتھ اسلام میں داخل نہیں ہوئے کہ وہ حرام مال لے رہے ہیں۔

ہماری ایک کمی:

آج کل ہمارے اندر یہ بیماری عام ہے کہ ہم صرف اپنی عبادت کو اسلام میں داخل کرتے ہیں۔ باقی شعبوں میں اپنی مرضی کرتے ہیں مثلاً بعض لوگ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے احکام پر عمل کر لیتے ہیں۔ عمرے بھی کرتے رہتے ہیں۔ تلاوت بھی کرتے ہیں، تسبیحات بھی پڑھتے ہیں لیکن تجارت کے معاملات میں سود لیتے دیتے ہیں یا کم تولتے ہیں یا کم ناپتے ہیں یا جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں یا دھوکہ دیتے ہیں یا وعدہ خلافی کرتے ہیں اور اگر ملازمت کرتے ہیں تو اس میں کام چوری کرتے ہیں، محنت پوری نہیں کرتے، تنخواہ پوری لے لیتے ہیں، یا وقت پورا دیا، کام بھی کیا لیکن بے دلی سے کیا۔ ایسا کام ادا نہ کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ بھی کام چوری میں داخل ہے۔

یہ شیطان کی پیروی ہے:

اسی طرح معاشرت کے متعلق اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے مثلاً لوگوں کی غیبت بھی کرتے ہیں، گالم گلوچ بھی کرتے ہیں، لڑائی جھگڑے بھی کرتے ہیں، پڑوسی کو بھی ستاتے ہیں۔ بیوی بچوں کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش نہیں آتے۔ اسی طرح دیگر شعبوں اور غم و خوشی کے موقعوں پر بھی اسلامی احکام کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جن جن شعبوں میں ہم اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے،

ہمارے وہ شعبے اسلام میں داخل نہ ہوئے اور جب اسلام میں نہ ہوئے تو یہ شیطان کی پیروی ہے جو کہ ہمارا کھلا دشمن ہے۔

اب اندازہ کیجئے اس شخص کی بدقسمتی کا کہ جو اپنے ازلی دشمن کے نقش قدم پر چلے، اس کی ہدایات پر عمل کرے جو بات اس کا دشمن اس سے کہے، وہ اس پر عمل کرتا جائے۔ ایسے شخص کے مقدر میں تباہی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔

موجودہ سیاست اور اسلام:

آج ہمارا رونا اسی بات کا ہے کہ ہماری مسجدیں تو اسلام میں داخل ہیں۔ ہمارے بازار اسلام میں داخل نہیں ہوئے، ہمارے گھر بھی اسلام سے باہر ہیں، ہمارے کھیل کے میدان بھی اسلام سے باہر ہیں۔ ہمارا میدان سیاست بھی اسلام سے باہر ہے۔

دیکھئے! سیاست میں کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ اس قوم کو آزادی ملی تھی لیکن چون (۵۴) سال کے عرصے میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہم آزادی کی اہلیت رکھنے والی قوم نہیں ہیں بلکہ ہمارے اندر صرف محکوم رہنے کی صلاحیت ہے۔ ہم نے انگریزوں کی محکومی میں ڈیڑھ سو سال گذار کر غلامی کو تو سیکھا، آزادی کو نہیں سیکھا۔ آزادی کے لئے جن اعمال و اوصاف اور جن اخلاق و کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم ان سے خالی ہیں۔

دین پر عمل کرنے کا لازمی تقاضا، حکمرانی:

اللہ رب العالمین نے ہمیں ایک ایسا دین دیا تھا۔ جس کا لازمی تقاضا حکمرانی تھی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (سورۃ نور ۵۵)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا۔''

صحابہ کرام نے یہ شرط پوری کرکے دکھائی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس وعدے کو پورا کیا۔ صحابہ کرام ایمان میں پکے اور عمل میں صالح تھے۔ ان کا دماغ بھی اسلام میں داخل تھا۔ دل بھی اسلام میں داخل تھا۔ آنکھیں، کان، ناک غرضیکہ پورا جسم اور جسم سے نکلنے والے سارے اعمال اسلام میں داخل تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں کے اندر دنیا نے یہ حیرت ناک کرشمہ دیکھ لیا کہ وہ قوم جو بدو اور جاہل قوم تھی، جس نے کبھی حکومت خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ چند ہی سالوں کے اندر دنیا کی دو سپر پاوروں کو روند کر پوری دنیا کے لئے واحد سپر طاقت بن گئی۔ کسی نے خوب کہا کہ ''صحابہ کرام جب جزیرہ نمائے عرب سے نکلے تو ان کے ہاتھوں میں اونٹوں کی مہاریں تھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہاتھوں میں قوموں کی مہاریں آگئیں۔'' اور مسلمانوں نے دنیا پر ایک ہزار سال تک اس طرح حکومت کی کہ وہی سپر طاقت تھے۔

تو اسلام نے ہمیں وہ اعمال دیئے ہیں کہ اگر ہم ان کو اختیار کرتے تو ہم ہی سپر طاقت ہوتے، ہمارے مقابلے میں دنیا کی اور قوم نہ ہوتی لیکن ہم نے اس آیت پر عمل نہ کیا۔ ہمارے دلوں میں ایمان تو تھا لیکن پورے اسلام میں داخل نہ ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم محکوم بنے ہوئے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ایک محکوم قوم کی جو صفات ہوتی ہیں۔ وہ ساری ہمارے اندر ہیں اور ایک حاکم کی جو صفات ہوتی ہیں، وہ ہمارے اندر نہیں رہیں۔

حاکم قوم کی صفت اور ہمارا حال:

حکمران قوم کی سب سے پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے قومی مفاد کے مقابلے میں ذاتی مفاد کو ترجیح نہیں دیتا۔ اپنے مفاد کو پس پشت ڈال کر قومی مفاد کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اس وقت کی جتنی حکمران قومیں آپ دیکھیں گے، ان سب کے اندر یہ صفت موجود ہے۔ وہاں بچے بچے کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ قومی مفاد ذاتی مفاد پر مقدم ہے۔ وہاں کے بچے، بڑے، مرد اور عورتیں قومی مفاد کی خاطر اپنے بڑے بڑے مفادات کو قربان کر دیتے ہیں۔ جبکہ ہمارا حشر اس کے برعکس ہے۔ ہم اپنے ایک روپے کی خاطر قوم کے ایک لاکھ روپے کا بھی نقصان کر دیں، ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کا تماشا ہم روز مرہ کی زندگی میں دیکھ رہے ہیں۔

بہت سے تاجر چیزوں کے اندر ملاوٹ کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی صحتیں خراب ہو رہی ہیں۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ دوائیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں نمبر ایک اور نمبر دو۔ ہمارے ہاں سڑکیں گندی پڑی ہیں۔ ان کا تعفن دور دور تک پھیل رہا ہے۔ کچرا گاڑیاں موجود ہیں، کوڑا اٹھانے کے لئے نہیں آتیں۔ نہ اٹھانے میں ان کا مفاد یہ ہے کہ جو لوگ کچرے میں سے سامان نکالتے ہیں، وہ انہیں اس بات کے پیسے دیتے ہیں کہ یہ کچرا مت اٹھاؤ، ہمیں اس میں سے چیزیں ملتی ہیں۔ جس کے عوض میں پیسے ملتے ہیں۔ گویا تھوڑا سا دنیوی مفاد حاصل کرنے کے لئے پورے معاشرے کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے نجانے کتنی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔

سرکاری دفاتر میں رشوت کا بازار گرم ہے۔ بہت سے لوگ بجلی کے تار چوری کر کے لے جاتے ہیں۔ بجلی والوں کے کھمبے چوری ہو رہے ہیں جس کی وجہ

ہول (Main Hole) کے ڈھکنوں تک چوری ہو رہے ہیں۔ کتنے واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آپ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ مین ہول میں بچہ گر کر مر گیا ہے۔ اندازہ کیجئے! جو مین ہول وہ اٹھا کر لے گئے، وہ تو دس بیس روپے میں فروخت کیا ہوگا لیکن اس معمولی رقم کی خاطر کتنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیا۔ یہ آزاد قوموں کا شیوہ نہیں ہوتا۔

بلاشبہ اس وقت کی آزاد قوموں کے پاس ایمان نہیں، نماز اور روزہ نہیں لیکن حکمران قوم بننے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ صفات ان کے اندر موجود ہیں۔

حکومت کب ملے گی؟

ہر عمل کے کچھ اثرات ہوتے ہیں۔ ایمان کا اثر یہ ہے کہ آخرت میں جس پر ثواب ملے گا، عذاب سے بچیں گے لیکن اس پر حکومت ملنے کا وعدہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اگر ایمان لاؤ گے تو حکومت ملے گی بلکہ یہ کہا ہے کہ اگر اپنے سارے اعمال کو ٹھیک کرو گے تو حکومت ملے گی۔ اپنی تجارت کو، اپنی سیاست کو، اپنی معیشت کو، اپنی معاشرت، منڈیوں اور بازاروں کو، سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کو، ان سب کو اسلام میں داخل کرو گے تو حکومت ملے گی۔

اہل یورپ کی ایک اچھی صفت:

یورپ کے اندر شرک اور کفر، فحاشی اور عریانی تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ کام نہیں ہوتا کہ اپنے معمولی مفاد کی خاطر قوم کو تباہ کر دیا جائے۔

وہ اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ ہم اس وقت تک کامیاب حکومت نہیں چلا

گئے جب تک ہماری تجارت صحیح اصولوں پر نہ ہوگی۔ اگر ہم نے تجارت میں بدمعاملگی اور دھوکہ بازی کی تو ہماری تجارت تباہ ہو جائے گی۔ تجارت تباہ ہوئی تو حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ چنانچہ وہ تجارت میں دھوکہ بازی نہیں کرتے، جھوٹ نہیں بولتے، وعدہ خلافی نہیں کرتے، اور جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے جبکہ ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

ہم نے یورپ کی صرف برائیاں حاصل کیں:

ہم نے یہ کیا کہ اسلام کی اچھی باتیں تو ان کو دے دیں اور ان کی برائیاں خود لے لیں۔ صاحب بہادر نے کھڑے ہو کر موتنا اور پتلون پہننا تو سیکھ لیا، ٹائی لگانا بھی سیکھ لیا لیکن سچ بولنا نہ سیکھا، وعدہ پورا کرنا نہ سیکھا، کام چوری سے بچنا نہ سیکھا، محنت کرنا نہ سیکھا، قومی مفاد کے لئے قربانی دینا نہ سیکھا۔ صرف ان جیسا لباس پہن کر ترقی کے خواب دیکھنے لگے۔ یہ آزاد قوموں کا طرز عمل نہیں ہوتا۔

ایک عبرتناک واقعہ:

مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نے اپنے کسی وعظ میں بیان فرمایا ہے۔ مکہ مکرمہ میں ایک بہت بڑے شیخ تھے جو بڑی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ ان کا انتقال ہوا۔ انہیں مکہ مکرمہ کے قبرستان "جنت المعلیٰ" میں دفن کیا گیا۔ کچھ دن کوئی اور جنازہ آیا۔ جس کے لئے ان کے برابر میں قبر کھودی گئی۔ چونکہ وہاں قبروں کی جگہ بہت کم ہوتی ہے۔ قریب قریب ہوتی ہیں۔ جب نئی قبر کھودی گئی تو اس میں ان کی قبر کھل گئی۔ جب ان کی قبر کھلی تو لوگوں نے عجیب وغریب تماشہ دیکھا کہ اس قبر سے شیخ صاحب غائب ہیں اور ان کی جگہ یورپین نوجوان

لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ تحقیق کی گئی کہ یہ کیا قصہ ہے؟ یہاں پر جس شیخ کو دفن کیا گیا تھا وہ کہاں گئے اور یہ لڑکی یہاں سے آ گئی۔

پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ لوگ جمع ہو کر ان کی قبر کی طرف آئے اور یہ منظر دیکھنے لگے۔ اسی مجمع میں ایک صاحب بولے کہ اس لڑکی کو میں جانتا ہوں۔ یہ فرانس کی لڑکی ہے اور میری شاگرد ہے۔ میں اتنے سال سے فرانس میں رہتا ہوں اور چھٹیوں پر یہاں آیا ہوا ہوں۔ یہ لڑکی ادھر میرے پاس پڑھنے آتی تھی۔ اس کے والدین عیسائی ہیں۔ میں نے اسے دین کی کچھ باتیں بتانا شروع کیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایمان ڈال دیا۔ یہ خفیہ طور پر مسلمان ہو گئی۔ میں اسے مسلمان ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔ اگرچہ اس کا سارا خاندان عیسائی ہے مگر یہ خود پکی مسلمان ہوئی تھی۔ نماز بھی چوری چھپے پڑھتی تھی۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ یہاں کیسے آ گئی! میں فرانس جا رہا ہوں، وہاں جا کر اس کی تحقیق کروں گا۔

جب یہ واپس جانے لگے تو کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اور اسے عیسائیوں کے فلاں قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ ان کے وہاں قبرستان کے ذمہ داران کو بتایا کہ یہ لڑکی تو مکہ مکرمہ کے قبرستان میں پڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اسے یہاں دفن کیا تھا۔ کہا کہ ذرا کھول کر دیکھو۔ جب قبر کو کھولا گیا تو دیکھا کہ مکہ مکرمہ کے شیخ یہاں موجود تھے۔ گویا عیسائی خاندان کی لڑکی مکہ مکرمہ کے قبرستان میں اور مکہ مکرمہ کا شیخ فرانس میں عیسائیوں کے قبرستان میں۔ اب بہت زیادہ حیرت ہوئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

مکہ سے گئے ہوئے لوگ واپس آئے اور ان شیخ کی بیوی سے پوچھا کہ شیخ کے کیا حالات تھے۔ بیوی نے جواب دیا کہ میں نے ان کی کوئی اور بات تو قابل اعتراض نہیں دیکھی البتہ ایک بات ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ کہا کرتے تھے کہ اسلام کی

ساری باتیں بڑی اچھی ہیں لیکن ایک بات عیسائیت میں بڑی اچھی ہے۔ وہ یہ کہ عیسائیوں کے مذہب میں غسل جنابت فرض نہیں ہوتا۔

اب دیکھئے! اگرچہ ظاہر یہ شیخ تھے لیکن پورے کے پورے اسلام میں داخل نہیں تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام کا یہ عمل غلط ہے، اس کے مقابلے میں عیسائیوں کا نظریہ اچھا ہے تو یہ مومن نہ رہے۔ دل بھی اسلام میں داخل نہ رہا۔ اس کی سزا یہ ملی کہ دفن تو مکہ مکرمہ میں کئے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں عیسائیوں کے قبرستان میں پہنچا دیا۔ یہ بڑا عبرت ناک واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام پر زندہ رکھے اور اسلام پر موت آئے۔ جینا اور مرنا اسلام کے سارے اعمال پر ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام گناہوں سے بچنے کی توفیق دے جن گناہوں کے نتیجے میں ہم اپنی آزادی کو تقریباً کھو بیٹھے ہیں اور دوسری قومیں ہم پر مسلط ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید رسوائیوں سے بچائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين
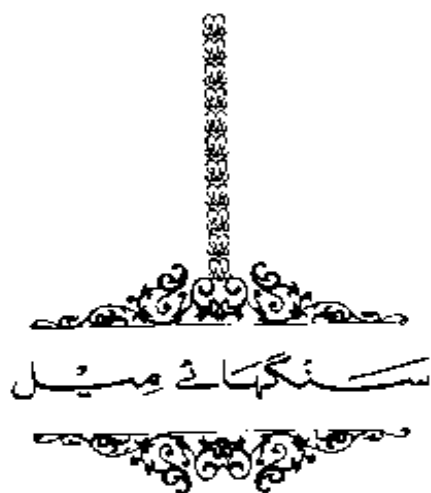
سنگہائے میل

ستارے میں

خطبہ مسنونہ:

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ۔ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا ○ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ و من یضللہٗ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و سندنا و مولانا محمداً عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہٖ و صحبہٖ اجمعین۔ وسلم تسلیماً کثیراً۔

اما بعد!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ○ (سورۃ الفاطر: ۲۸)

تمہید:

بزرگانِ محترم، حضرات علماءِ کرام، محترم اساتذہ، عزیز طلبہ، معزز حاضرین، محترم خواتین، میری ماؤں، بہنو اور بیٹیو!

میرے لئے یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے کہ ہمارے بزرگوار محترم اور ہمارے والدِ ماجد رحمتہ اللہ علیہ کے رفیقِ کار حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب دامت برکاتہم کے اس عظیم ادارے میں حاضر ہو کر آپ سے خطاب کا موقع مل رہا ہے۔

الحمد للہ، حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب دامت برکاتہم سے ہمارا اس وقت سے طالبعلمانہ تعلق ہے، جب سے ہم نے پاکستان میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔ میں نے یہ دیکھا کہ جب بھی ملک میں کوئی ایسا بڑا مسئلہ پیش آیا جس میں پاکستان کے تمام بڑے علماء کو مل کر کوئی کام کرنے کی ضرورت پیش آئی تو میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مشوروں میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم عموماً شریک رہے اور کئی بار ہمارے والد ماجد یہاں تشریف بھی لائے۔ میں بھی یہاں ایک مرتبہ پہلے حاضر ہوا ہوں لیکن خطاب کا موقع آج پہلی مرتبہ مل رہا ہے۔ میں اپنے بزرگ محترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم، ان کے لائق صاحبزادگان اور منتظمین مدرسہ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے یہاں بلا کر اس سعادت کا موقع عطا فرمایا۔

عجیب اتفاقات:

میرے یہاں آنے کا سلسلہ کچھ عجیب طریقے سے چلا ہے بلکہ اب یہ عجیب

بھی نہیں رہا، اس لئے کہ کبھی مرتبہ ایسا نہیں ہوا بلکہ ایسا ہونے ہی لگا ہے۔ یہاں آنے کا قصہ یہ ہے کہ گذشتہ ہفتے اسلامی نظریاتی کونسل کا اجلاس تھا۔ اس کا رکن ہونے کی وجہ سے مجھے وہاں جانا تھا۔ اتمان زئی ضلع چارسدہ میں دارالعلوم نعمانیہ کے مہتمم مولانا روح اللہ صاحب سے ہمارا کئی سال سے وعدہ چل رہا تھا کہ ان کے ہاں ختم بخاری میں حاضری ہوگی۔ کئی پروگرام بنے، تاریخ بھی طے ہوگئی اور انہوں نے اشتہار بھی دے دیئے لیکن اچانک کوئی ایسی بات پیش آگئی کہ میں نہ جا سکا اور عذر بھی عذر لنگ نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسا عذر ہوتا کہ وہ بھی اسے تسلیم کرتے۔ مثلاً پہلے سال یہ ہوا کہ افغانستان پر امریکہ کا حملہ ہو گیا۔ دوسرے سال مجھے بیماری پیش آگئی، اگلے سال انہیں کوئی عذر پیش آگیا۔ اب کی بار میں نے سوچا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں تو جانا ہے ہی، وہاں بھی چلے جائیں گے۔ اس خیال سے وہاں جانے کا وعدہ کر لیا۔

مدرسوں میں آخری سہ ماہی کے ایام ان کی جان کنی کے دن ہوتے ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ سب پر اسباق ختم کرنے کا بخار چڑھا ہوتا ہے۔ اس بخار میں ہم بھی مبتلا ہوتے ہیں تو وقت نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ سوچا کہ اس مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ اجلاس آخری مرتبہ ہو رہا ہے کیونکہ ہر کونسل کی مدت تین سال ہوتی ہے۔ اس اجلاس پر یہ مدت ختم ہو جائے گی، پھر نئی تشکیل ہوگی۔ چونکہ یہ آخری اجلاس تھا اور بہت اہم تھا اس لئے اس میں شرکت ناگزیر تھی تو عثمان زئی کا وعدہ کر لیا۔ جب انہوں نے اشتہار بھی دے دیا تو اسلام آباد سے خط آیا کہ کونسل کا اجلاس ملتوی ہو گیا ہے۔

اتمان زئی کا وعدہ کر چکے تھے، اس لئے وہاں جانا پڑا۔ ابھی وہاں پہنچے نہیں تھے کہ مولانا شکیل احمد صاحب کو پتہ چل گیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں تو انہوں نے

وہیں سے ٹیلی فون کے ذریعے دعوت دی۔ مولانا شکیل صاحب چنیوٹ میں ہوتے ہیں۔ دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں۔ تخصص فی الفقہ انہوں نے مولانا عبدالشکور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ جامعہ حقانیہ ساہیوال میں کیا۔

انہوں نے ایک بڑے مدرسے کی بنیاد چنیوٹ میں رکھی تھی۔ ہم نے ان سے معذرت کی کہ ہم یہاں پھنس گئے ہیں، اب ہمیں واپس جانا ہے، کہا اچھا اب واپس چلے جائیے، دوبارہ آجائیے۔ ادھر پتہ چلا کہ کونسل کا اجلاس اگلے ہفتے ہو رہا ہے (انشاء اللہ پرسوں شروع ہوگا) تو ہم نے سوچا کہ چلو مولانا شکیل احمد صاحب کے پاس چنیوٹ جانے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ چنیوٹ کا وعدہ کیا ہی تھا کہ دو گھنٹے کے بعد سرگودھا سے مولانا اشرف علی صاحب کا فون آیا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ چنیوٹ آنے والے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ وقت دے دیجئے۔ سوچا کہ چنیوٹ تو جا ہی رہے ہیں، وہاں سے اسلام آباد جانا ہے تو راستے میں ایک رات سرگودھا گزار لیں گے، وہاں جلسہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ان سے سرگودھا جانے کا وعدہ کر لیا۔ انہوں نے اخبار میں اشتہار دے دیا۔

اخبار میں اشتہار دیا تو بھائی یوسف صاحب کا ٹیلی فون پہنچ گیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ اس علاقے میں آنے والے ہیں۔ ہمیں بروقت اطلاع مل گئی ہے اور حضرت والد صاحب دامت برکاتہم کا فرمان ہے کہ آپ ہمارے ہاں اختتام اسباق کی تقریب میں شرکت فرمائیں۔ ان کی دعوت زیادہ پر کشش تھی کیونکہ عرصے سے میرا دل چاہتا تھا کہ یہاں حاضری دوں۔ حضرت مدظلہم کی عقیدت و محبت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ یہاں بار بار حاضری ہو تو میں نے کسی تامل کے بغیر اس دعوت کو قبول کر لیا۔

اب جامعہ امدادیہ فیصل آباد سے فون آیا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ دارالعلوم فیصل آباد میں آنے والے ہیں تو اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ فیصل آباد

تشریف لائیں اور جامعہ امدادیہ میں نہ آئیں۔ ہم نے کہا واقعی نہیں ہوسکتا تو آج صبح وہاں بھی جانا ہوا۔ کئی اور جگہوں سے اب بھی ٹیلی فون آرہے ہیں۔

یہ فال نیک ہے:

لیکن میرے لئے یہ فال نیک ہے اس لئے کہ الحمد للہ، ہم طالب علم ہیں اور اپنی طالب علمی کو اپنے لئے سرمایۂ نجات بھی سمجھتے ہیں اور سرمایۂ حیات بھی سمجھتے ہیں۔ طلبہ کی برادری مساکین کی برادری ہے اور مساکین ہی کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی تھی:

﴿اللّٰهُمَّ أَحْيِنِي مِسْكِيْنًا وَأَمِتْنِي مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ﴾ (جامع ترمذی)

"اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں میری موت ہو اور میرا حشر بھی مساکین کے ساتھ ہو۔"

ہمارے والد صاحب غالباً اسی دعا کی روشنی میں فرمایا کرتے تھے کہ:

"یا اللہ! میرا جینا بھی طلبہ کے ساتھ ہو، میرا مرنا بھی طلبہ کے ساتھ ہو اور میرا حشر بھی طلبہ کے ساتھ ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ آخر وقت تک دارالعلوم کراچی کے احاطے میں دارالعلوم کے مکان میں قیام رہا۔ دارالعلوم ہی میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور ان کی قبر پر طلبہ نے مزدوروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ خود طلبہ نے ان کی قبر تیار کی اور ایسی صاف بنائی کہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں نے کبھی ایسی صاف قبر نہیں دیکھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طلبہ نے اپنی آنکھوں کی پلکوں سے اس کی صفائی کی ہے۔ ان کا جنازہ بھی طلبہ نے اٹھایا تھا اور طلبہ ہی نے انہیں سپرد خاک کیا تھا۔ جنازہ

میں اتنا ہجوم تھا کہ جنازہ کی چارپائی پر لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے سمندر میں وہ جنازہ تیرتا ہوا جا رہا ہے۔

آخری بیماری کے زمانے ہی میں ایک مرتبہ یہ خبر مشہور ہوگئی کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب ملک بیرون ملک سے خطوط، ٹیلی فون اور تار کا ایک تانتا بندھ گیا۔ اس زمانے میں فیکس اور موبائل ٹیلی فون نہیں ہوتے تھے۔ باقی جتنے ذرائع تھے، ان سب سے تعزیت کے خطوط آنا شروع ہوگئے تو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگرچہ خبر غلط اور جھوٹی مشہور ہوئی تھی لیکن مجھے ایک بات کی خوشی ہوئی کہ الحمد للہ، الحمد للہ، اللہ کے نیک بندے مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

اگر اللہ والے کسی سے محبت کریں تو یہ فال نیک ہیں۔ طلبہ اور مدرسے کے اساتذہ مجھ ناچیز سے ایسی محبت کریں تو میرے لئے فال نیک ہے اور اللہ رب العزت سے قوی امید ہے کہ میری وہ کمزوریاں جن سے میں واقف ہوں اور میرا رب واقف ہے، انشاء اللہ، ان اللہ والوں کی محبت اور حسن ظن سے اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں کی بھی اصلاح فرما دے گا۔

میری زندگی کے عزیز ترین اور لذیذ ترین لمحات:

واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی کے عزیز ترین، محبوب ترین اور لذیذ ترین لمحات وہ ہوتے ہیں جو میرے طلبہ کے ساتھ گذرتے ہیں۔ دارالعلوم کی تمام انتظامی ذمہ داریوں کا بوجھ مجھ پر ہے، فتویٰ کی ذمہ داری بھی ہے۔ ملک کے بجانے کتنے اداروں اور کتنی کونسلوں، کتنے بورڈوں اور کتنی کمیٹیوں کا رکن ہوں۔ ان کے اجلاس ہوتے ہیں، ان کے لئے بھی محنت و تیاری کرکے ان میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ غیر ملکی سفروں کا بھی ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان سب مصروفیات کے باوجود میں نے اپنا تدریس

کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ ۱۹۶۰ء سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب ۲۰۰۳ء ہے۔ الحمدللہ، مجھے یہ خدمت دیتے ہوئے عیسوی اعتبار سے تینتالیس (۴۳) سال ہو گئے۔ درسِ نظامی کی تمام علوم وفنون کی کتابیں ابتداء سے انتہاء تک پڑھانے کی اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی۔ میرے مرشد حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس زمانے میں مجھ سے کہا بھی، جب میری صحت بار بار بگڑ رہی تھی اور کاموں کا تحمل نہیں ہو رہا تھا، کہ اسباق چھوڑ دو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اجازت دیجئے کہ کم از کم ایک درس برقرار رکھوں، فرمایا کہ اجازت ہے لیکن اپنے تحمل کو دیکھو۔ الحمدللہ، آج تک درس کا سلسلہ جاری ہے اور مسلم شریف کا درس مجھ سے متعلق ہے۔

میں نے اس خواہش کا اظہار اس لئے کیا کہ میں واقعۃً کہتا ہوں کہ میری زندگی کا لذیذ ترین وقت وہ ہوتا ہے جو طلبہ کے درمیان گذر جائے۔ ان سے باتوں میں گذرے یا ان سے خطاب میں گذرے۔ الحمدللہ، میں اس وقت بھی آپ حضرات سے خطاب کرتے ہوئے، انتہائی فرحت محسوس کر رہا ہوں۔ اگرچہ مسلسل سفر کی وجہ سے قدرے تھکاوٹ ہے۔ اور آج مجھے سرگودھا میں بھی ایک جلسے میں خطاب کرنا ہے۔ لیکن الحمدللہ میں اسے اپنی روح کی غذا سمجھتا ہوں کہ اپنی برادری سے خطاب کروں۔ میری دُعا بھی یہی ہے کہ:

﴿اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّ أَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَ احْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ﴾

خوشی اور احتساب کا دن:

آج دارالعلوم فیصل آباد کے اختتامِ اسباق کی یہ تقریب ہے۔ الحمدللہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد دورۂ حدیث سے فارغ ہوئی ہے، اور ایک تعداد طالبات کی بھی

دورۂ حدیث سے فارغ ہوئی ہے۔ اسی طرح طلبہ کی ایک بڑی تعداد اور طالبات کی بھی ایک تعداد حفظ قرآن سے فارغ ہوئی ہے۔

اسی طرح تخصص فی الافتاء سے بھی کئی طلبہ الحمدللہ فارغ ہوئے ہیں۔ ایسے ہی موقع پر جب تعلیمی سال کا اختتام ہو رہا ہوتا تھا۔ میرے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! جتنے جتنے بڑے بڑے یا چھوٹے تاجر ہیں، جب ان کا تجارتی سال پورا ہوتا ہے تو پورے سال کا کچا چٹھہ تیار کرتے ہیں کہ سال بھر میں ہم نے کیا کمایا اور کیا کھویا۔ کتنا آیا، کتنا خرچ ہوا اور بچت کیا ہوئی اور مؤمن بھی اپنی جان اور مال کا تاجر ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

"خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں (اور اس کے) عوض میں ان کے لئے بہشت (تیار کی) ہے۔"

ہمارا سامان تجارت ہماری جانیں ہیں جو ہم نے اللہ رب العالمین کے ہاتھ فروخت کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خریدار ہیں اور اس کا ثمن (قیمت) انشاء اللہ جنت کی شکل میں ملنے والا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

﴿كُلُّ مَنْ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا﴾

(مسلم، کتاب الطہارۃ، ترمذی، کتاب الدعوات)

"جو شخص بھی صبح کرتا ہے تو وہ اپنی جان کی بیع کرتا ہے پھر وہ اپنی جان کو اللہ کے عذاب سے چھڑا لیتا ہے یا ہلاکت اور بربادی

میں ڈال دیتا ہے۔"

ہماری زندگی ہماری پونجی ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ ہماری متاع ہے۔ اگر ہم نے اسے صحیح مصرف پر لگایا تو ہمیں اس کی قیمت پر جنت ملنے والی ہے اور اگر خدانخواستہ، خدانخواستہ اس متاع کو ہم نے ضائع کر دیا تو پھر دوسرا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ ہم اس سے پناہ مانگتے ہیں۔

تو والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے کہ جب ہمارا تعلیمی سال ختم ہوتا ہے تو ہمیں بھی اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہمارے علم میں کتنی ترقی ہوئی۔ عمل صالح میں کتنی ترقی ہوئی اور اخلاق میں کتنی ترقی ہوئی؟ اور ہمارے گناہوں اور غفلت وسستی میں کتنی کمی واقع ہوئی؟ یہ حساب لگانا ہماری ذمہ داری اور فرض منصبی ہے۔

آج کا دن جہاں خوشیوں کا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تعلیمی سال کا یہ مشقت سفر مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ وہاں ہمیں اس بات کا بھی جائزہ لینا ہے کہ اس سفر میں ہم نے کیا کمایا اور کیا کھویا؟

طلبہ، اساتذہ اور منتظمین اپنا اپنا جائزہ لیں:

طلبہ اس بات کا جائزہ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پڑھنے کے لئے جتنی قدرت دی تھی، کیا انہوں نے اتنی محنت کی؟ اسباق میں شرکت کی، جتنی پابندی کرنا چاہیے تھی، کیا انہوں نے اتنی پابندی کی؟ اس علم کے مطابق جتنا عمل کرنا چاہیے تھا، اتنا انہوں نے عمل کیا؟

اساتذہ کرام کو یہ جائزہ لینا چاہیے کہ ان پر طلبہ کی تعلیم وتربیت کی جو نازک ذمہ داریاں عائد ہوئی تھیں، ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وہ جتنا جتنا کام کر سکتے تھے، کیا انہوں نے وہ کام کئے یا اس میں کہیں کوتاہی تو نہیں ہوئی؟ اسباق کی

تیاری میں، مطالعہ میں، اسباق سمجھانے میں اور طلبہ کی اخلاقی تربیت میں کیا ان سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی؟

منتظمین کو بھی اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے جو فرائض منصبی تھے، ان میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی۔ شعبہ حسابات کو جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ مدرسے کی پیسوں کی صورت میں جو نازک اور خطرناک امانت ہمارے پاس رہی، اس امانت کو ہم نے صحیح جگہ اور صحیح مصرف پر خرچ کیا ہے یا نہیں؟ کیونکہ آخرت میں ایک ایک پائی کا حساب ہونے والا ہے۔

مدارس کے پیسے خوفناک امانت ہیں

یاد رکھئے! یہ مدارس کے پیسے خوفناک امانت ہیں۔ میں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہی کا ملفوظ آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے انتقال سے نو ماہ قبل دارالعلوم کا سارا انتظام و انصرام میرے سپرد فرما دیا۔ مجھے اور میرے بھائی مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دونوں کو نائب صدر مقرر کیا لیکن تمام انتظامی ذمہ داری میرے سپرد فرمادی۔ انتقال سے دو چار روز پہلے مجھ سے فرمانے لگے کہ یہ جو حدیث ہے کہ غزوۂ خیبر سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالا۔ آپ کا ایک آزاد کردہ آپ کے کجاوے کو کھول رہا تھا، اچانک کسی جانب سے کوئی تیر آکر اسے لگا جو جان لیوا ثابت ہوا، جس سے اس کا انتقال ہوا۔

سفر کیسا؟ جہاد کا۔

کس کے ساتھ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔

کس کی خدمت کرتے ہوئے تیر لگا؟ تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے ہوئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ منظر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

﴿هَنِيئًا لَكُمْ شَهَادَتُهُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!﴾

"یا رسول اللہ! اس کو شہادت مبارک ہو۔ (کہ کیسی عظیم شہادت ملی)"

آپ نے جواب میں فرمایا: میں اس کے اوپر اس چادر کو آگ بن کر بھڑکتا ہوا دیکھ رہا ہوں جو اس نے مال غنیمت کے تقسیم ہونے سے پہلے اٹھالی تھی۔

"جہنم کی پٹیاں بن گئی ہیں"

آپ کا یہ جواب سن کر صحابہ کرام ڈر گئے۔ ایک صحابی نے چپل کی ایک یا دو پٹیاں لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیں۔ اس وقت غنیمت تقسیم ہو چکی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کیا: یا رسول اللہ! چپل کی یہ ایک یا دو پٹیاں مال غنیمت تقسیم ہونے سے پہلے میں نے لے لی تھیں۔ اب انہیں واپس لایا ہوں۔

آپ نے فرمایا:

﴿شِرَاكٌ أَوْ شِرَاكَانِ فِي النَّارِ﴾ (مسلم، کتاب الایمان)

"(چپل کی) یہ ایک پٹی یا دو پٹیاں آگ کی ہیں۔ (راوی کو شک ہے کہ ایک پٹی تھی یا دو)"

چپل کی پٹی کی قیمت ہی کیا ہوتی ہے۔ اس پر بھی یہ وعید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ

عام طور پر اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر تم یہ چیزیں واپس نہ لاتے تو تمہارے لئے جہنم کی آگ بن جاتیں، لیکن اب چونکہ واپس لے آئے ہو، اس لئے جہنم کی آگ سے بچ گئے۔

فرمایا کہ اس حدیث کا یہ مطلب میرے نزدیک صحیح نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے چوری اس وقت کی تھی جب مال تقسیم نہیں ہوا تھا اور واپس اس وقت لائے ہو جبکہ مال غنیمت تقسیم ہو چکا ہے اور غانمین اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس میں تمام غانمین کا حق ہے۔ سب کی مشترک ملکیت ہے اور اس کو تمام غانمین میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ (اگر کوئی کہے کہ اسے بیچ کر اس کی قیمت تقسیم کی جا سکتی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس چیز کی قیمت تو ایک درہم کے برابر بھی نہ ہوگی اور اگر ایک درہم کے برابر بھی ہو تو اسے چودہ سو (یا اختلاف روایات کے مطابق اٹھارہ سو) مجاہدین میں کس طرح تقسیم کیا جاتا۔ مجاہدین واپس جا چکے تھے۔ اب اسے تقسیم کرنے کے لئے اس سے زیادہ خرچہ ہو جائے گا جتنی اس کی قیمت ہے) لہٰذا جب غانمین میں تقسیم کرنا ممکن نہیں، اور ان سے معاف کرانا بھی ممکن نہیں (کہ ان افراد میں سے بہت سوں کو تو آپ جانتے بھی نہیں) تو یہ اب تمہارے لئے جہنم کی چیزیں بن گئی ہیں۔

جو حکم مالِ غنیمت کا ہے، وہی مدرسوں کے مال کا ہے!

والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کہ جو حکم مالِ غنیمت کا ہے، وہی حکم مدرسوں کے مال کا ہے۔ اس لئے کہ مدارس کے اندر آنے والا چندہ ہزاروں لوگوں کا ہوتا ہے۔ کوئی ایک روپیہ دیتا ہے، کوئی پانچ روپے دیتا ہے، کوئی سو دیتا ہے، کوئی ہزار دیتا ہے، کوئی لاکھ دیتا ہے، دینے والوں میں مرد، عورتیں،

ملکی اور غیر ملکی افراد سب شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ چندہ مدرسے کے کاموں اور طلبہ کے لئے دیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ کتنے ملکوں اور شہروں کے علاقوں کے ہوتے ہیں۔ مدرسہ کی رقم مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی شخص اس میں سے چوری دھوکہ بازی کرے تو وہ ان لاتعداد انسانوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ ان سب سے وہ کیسے معاف کرائے گا۔ اس لئے مدارس کا پیسہ بڑا خطرناک ہے۔

یہ واقعہ طلبہ اور اساتذہ کے لئے بھی عبرت ناک ہے:

یہ واقعہ میں اس لئے سنا رہا ہے کہ اس مال کا تعلق شعبہ حسابات سے تو ہوتا ہی ہے۔ کیونکہ ہر مدرسے کے اندر ایک شعبہ حسابات ہوتا ہے۔ اس پر اور مدرسہ کے مہتمم پر تو سب سے زیادہ بھاری ذمہ داری ہے ہی لیکن یاد رکھئے کہ یہ واقعہ طلبہ اور اساتذہ کے لئے بھی عبرت ناک ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی استاد نے تنخواہ پوری لی لیکن وقت پورا نہیں دیا تو اس کم دیے ہوئے وقت کے مقابلے میں جو پیسہ آیا، وہ سور کے گوشت کی طرح حرام ہے۔ اور ایسا حرام ہے کہ "شراک من النار او شراکان من النار" کا مصداق ہے۔

اور طلبہ کے لئے اس لئے کہ ان کے پاس مدرسے کی چیزیں امانت ہوتی ہیں۔ جس کمرے میں وہ رہتے ہیں، وہ کمرہ ان کے پاس امانت ہے۔ جس درسگاہ میں وہ پڑھتے ہیں، وہ درسگاہ ان کے پاس امانت ہے۔ جس چارپائی پر وہ بیٹھتے ہیں۔ وہ چارپائی ان کے پاس امانت ہے۔ مدرسہ کی جو کتابیں وہ پڑھتے ہیں۔ وہ مدرسہ کی طرف سے ان کے پاس امانت ہیں۔ اسی طرح مدرسہ کی دیگر املاک جیسے دیواریں، عمارت اور درخت پودے وغیرہ بھی امانت ہیں۔ یہ سب مدرسے کی مقدس امانتیں ہیں۔ اگر آپ انہیں خراب کریں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ "شراک من النار

او حضرا کان من النار '' کا مصداق بن جائیں۔

اس لئے سال کے آخر میں اس بات کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہم نے خدانخواستہ مدرسہ کے پیسے یا اس کی املاک میں دانستہ یا نادانستہ کوئی کوتاہی یا خیانت تو نہیں کی۔

وقت میں کوئی خیانت یا کوتاہی تو نہیں کی۔ محنت میں کوئی خیانت اور کوتاہی نہیں کی۔ اگر نہیں کی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ دعا بھی کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آئندہ اس پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔

مختلف درجات سے فارغ ہونے والوں کے لئے الگ الگ نصائح:

ایک بات تو یہ ہے۔ اب میں ایک بات ان سے کہوں گا جو دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے ہیں۔ پھر ایک بات ان سے کہوں گا جو درجہ تخصص سے فارغ ہوئے ہیں، پھر ایک بات ان سے کہوں گا جو درجہ حفظ سے فارغ ہوئے ہیں۔

اصلی طالب علمی کا اب آغاز ہوا ہے:

دورہ حدیث سے جو طلبہ فارغ ہوئے ہیں انہیں ان شاء اللہ وفاق المدارس کے امتحان میں کامیابی پر '' شہادۃ العالیہ '' ملے گی۔ پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ یہ شہادۃ العالیہ (بفتح اللام) نہیں ہے بلکہ شہادۃ العالیہ (بکسر اللام) ہے یعنی عالم ہونے کی سند۔

یہاں پر یہ بات سمجھ لیجئے کہ وفاق والوں کی یہ مجبوری تھی۔ اس مجبوری میں ہم بھی شریک تھے (عاملہ اور شوریٰ میں ہم بھی شامل تھے) کہ اسے کوئی نہ کوئی نام تو دینا ہی تھا۔ عام طور پر یہ نام جامعہ الازھر کے فارغ التحصیل علماء کی اسناد پر جاری ہوتا ہے تو ہم نے جامعۃ الازہر کی تقلید میں اس کا نام '' شہادۃ العالیہ '' تجویز کیا تھا قانونی

طور پر چونکہ خصوصیت اس کا معادل ایم۔اے عربی اور ایم۔اے اسلامیات (ڈبل ایم۔اے) سے کر دی تھی، اس لئے بھی اس کا یہ نام تجویز کیا گیا۔ اس کے معنی ہیں ”عالم ہونے کی گواہی یا عالم ہونے کی سند“ لیکن یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے جو سند جاری کی جاتی تھی، اس کا نام تھا ”سند الفراغ“ یعنی فارغ ہونے کی سند۔ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ ملفوظ بار بار سنا۔ وہ طلبہ سے فرماتے تھے کہ یہ سند جو تمہیں جاری کی جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم عالم دین بن گئے ہو بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے اندر قوت مطالعہ پیدا کر دی گئی ہے، اب اگر تم فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، علوم بلاغت، علم صرف و نحو، حدیث، اصول حدیث، تفسیر یا اصول تفسیر کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھو گے تو مطالعہ کے ذریعے سمجھ سکو گے، کہیں کہیں اتفاق سے کوئی مشکل پیش آ گئی تو وہاں لغت اور شروح سے مدد لی جا سکتی ہے، اب باقاعدہ درساً پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی عالم نہیں ہوئے بلکہ عالم بننے کا راستہ تیار ہو گیا۔ عالم اس وقت ہو گے جب اس قوت مطالعہ کو استعمال کرو گے، اپنے مطالعہ اور تحقیق کو بڑھاؤ گے، کہیں تدریس کے لئے مطالعہ کرو گے، کہیں تصنیف کا کام کرو گے تو اس میں مطالعہ کرو گے، اس سے علم بڑھے گا، فتویٰ کا کام کرو گے تو کئی کتابیں دیکھنا پڑیں گی۔ علم بڑھے گا۔ یہ کئی برس تک جب یہ سلسلہ جاری رہے گا تو ان شاء اللہ، تم دین کے عالم بن جاؤ گے۔ اب عالم دین نہیں بنے۔ بعض طلبہ کو یہ غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم عالم دین بن گئے۔ اس لئے ان سے وہ کہتا ہوں کہ ابھی عالم دین نہیں ہوئے بلکہ قوت مطالعہ پیدا ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ”اصلی طالب علمی کا اب آغاز ہوا ہے“۔

طالب علمی کبھی ختم نہیں ہوتی:

طالب علمی کبھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ یہ "من المهد الی اللحد" جاری رہتی ہے۔ الحمد للہ میں تو دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! مجھے مرتے دم تک طالب علم رکھئے۔ اگر اللہ تعالیٰ طالب علم بننے کا منصب عطا فرمائے تو یہ بہت بڑا منصب ہے۔ اس میں

﴿مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ﴾ (مسلم، مسند احمد بن حنبل)

کی بشارت ہے، فرشتے قدموں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ سمندروں کی مچھلیاں ان کے لئے استغفار کرتی ہیں۔

عالم دین ہونے کا معیار:

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے عالم دین ہونے کا ایک معیار بتایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر: ۲۸)

"خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے خشیت والے صرف علماء ہی ہوتے ہیں۔ اپنے علم کا جائزہ لیجئے کہ ہمارے اندر اللہ تعالیٰ کی کتنی خشیت پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ خشیت پیدا ہوئی ہے تو سمجھ لیجئے کہ کچھ علم آیا ہے، اور اگر نہیں پیدا ہوئی تو سمجھ لیجئے کہ محرومی ہے۔ فکر اور پریشانی کی بات ہے۔

اس خشیت کو ڈھونڈ رہے، تلاش کیجئے۔ یہ خشیت کہاں ملے گی؟ دکانوں میں

ملے گی؟ بازاروں میں؟ کارخانوں میں؟ نہیں نہیں بلکہ یہ خشیت والوں کے پاس ملے گی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (التوبہ ۱۱۹)

"اے ایمان والو! خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔"

والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ایک اہم ملفوظ:

یہ اللہ والوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جس سال ہم دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو میرے والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی سال تخصص فی الافتاء کا شعبہ قائم کیا۔ خود ہی تخصص فی الافتاء کا کام کراتے تھے۔ ہم دونوں بھائی تخصص کی جماعت میں تھے۔ کل چھ سات ساتھی تھے۔ حضرت والد صاحب بار بار فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! دورۂ حدیث تک پہنچنے کے بعد تم نے فقہ ظاہر کی تعلیم حاصل کرلی ہے۔ ابھی فقہ باطن کی تعلیم باقی ہے۔ جس اہتمام محنت اور کوشش سے تم نے فقہ ظاہر کے کام میں وقت لگایا ہے۔ اتنی بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ فقہ باطن کی طرف توجہ دو۔

تخصص فی الافتاء میں روزانہ سبق تو نہیں ہوتا تھا۔ البتہ فتویٰ نویسی کی وجہ سے روزانہ مجلس میں حاضری ہوتی تھی۔ شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو۔ جس دن وہ یہ بات نہ فرماتے ہوں کہ دیکھو! جب تک تم علم باطن کو حاصل نہیں کرو گے۔ عالم دین نہیں بنو گے۔ عالم دین بننا تو بہت بڑی بات ہے۔ جب تک باطن کی اصلاح نہ ہو، پورے مسلمان بھی نہیں ہو گے۔

میں یہ سن کر سنانے میں آ گیا۔ میری ساری پونجی کھولی گئی آئی۔ مجھ سے بار بار پوچھا جانے لگا کہ بتاؤ ہمارے لئے کیالائے ہو۔ میں نے عرض کیا: یا اللہ! میری تو پونجی ہی یہ تھی اور تو کچھ میرے پاس ہے ہی نہیں۔ فرمایا گیا کہ تمہاری ایک نیکی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب تم لکھ رہے تھے۔ تم نے دوات میں قلم ڈالا، اسے نکال کر جب لکھنے کے لئے کاغذ کے پاس لائے تو قلم میں سے روشنائی کی ایک بوند کاغذ پر گر گئی۔ تم نے قلم رکھا اور بوند صاف کرنے کے لئے کپڑے کو اٹھایا، اتنے میں ایک مکھی اس پر آ کر بیٹھ گئی جو اس کا پانی چوسنے لگی، تو تم نے یہ سوچ کر اپنے ہاتھ کو روک لیا کہ یہ اللہ کی مخلوق ہے، پیاسی ہے، پیاس بجھا لے تو پھر صاف کروں گا۔ یہ کام تم نے ہمارے لئے کیا تھا۔ تمہاری یہ نیکی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اسی کی بدولت تمہاری بخشش کرتے ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت کے بغیر عادۃً اصلاح نہیں ہوتی:

یہ باتیں اللہ والوں اور خشیت والوں کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (التوبہ۔ ۱۱۹)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔''

صادقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو زبان کے بھی سچے، دل کے بھی سچے اور عمل کے بھی سچے یعنی اللہ والے۔ اگر تمہیں وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود اور مختلف روحیوں اور فلسفیوں کی اصطلاحیں یاد نہ ہوں تو کوئی بات نہیں لیکن اللہ والوں کی صحبت

۲۔ معانی قرآن کی تعلیم

۳۔ سنت کی تعلیم

اور ایک چیز تربیت کی ہے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کا خلاصہ دو لفظوں میں نکل آیا۔

۱۔ تعلیم ۲۔ تربیت

آپ نے تعلیم تو کچھ حاصل کرلی ہے۔ الفاظ قرآن بھی سیکھے، معانی قرآن کا علم بھی حاصل کیا، جلالین پڑھی، بیضاوی پڑھی اور دورۂ حدیث میں سنت کی تعلیم بھی حاصل کی لیکن "تربیت" کا مرحلہ باقی ہے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوگا۔ اس وقت تک مکمل عالم نہیں ہوں گے اور اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے الفاظ میں کہتا ہوں کہ پورے مسلمان بھی نہیں ہوں گے۔

طلبہ دورۂ حدیث کے لئے پیغام کا حاصل:

اس لئے جو طلبہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے ہیں۔ ان کے لئے میرے پیغام کا حاصل دو چیزیں ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو عالم نہ سمجھو، طالب علم سمجھو اور یہ سمجھو کہ اصل طالب علمی اب شروع ہوئی ہے۔ اپنے علم کو بڑھاؤ۔ دنیا کی اشیاء اور مال پر تو قناعت کرو لیکن علم پر کبھی قناعت نہ کرو، علم ایسی چیز نہیں کہ اس پر قناعت کی جائے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ فقہ باطن کی طرف توجہ کرو اور اس کا راستہ سوائے اس کے نہیں کہ اپنے آپ کو کسی اللہ والے کے سپرد کردو۔

فارغ التحصیل طالبات کے لئے اہم نصیحت:

یہ تو دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والے طلبہ کی خدمت میں گذارشات تھیں اور یہی ساری باتیں ان طالبات سے بھی ہیں جو دورۂ حدیث سے فارغ ہوئی ہیں اور ایک بات ان سے الگ بھی کہنی ہے جو انہی کے ساتھ خاص ہے۔ وہ یہ کہ طلبہ تو درس نظامی آٹھ سال میں پڑھتے ہیں اور آپ نے چار سال پڑھا لیکن سند آپ کو بھی "شہادۃ العالمیہ" کی ملے گی۔ انصاف سے سوچو! کیا تمہاری علمی قابلیت اتنی ہی ہے جتنی ان طلبہ کی جنہوں نے آٹھ سال کھپائے۔

میں آپ کو طعنہ دینے کے لئے نہیں کہہ رہا بلکہ اس لئے کہہ رہا ہوں تاکہ آپ کے سامنے ایک حقیقت واضح رہے کہ آپ نے آٹھ سال کی بجائے چار سال لگائے ہیں۔ آپ کا نصاب ہم نے ہی بنایا تھا (وفاق کی عاملہ نے بنایا تھا اور میں اس کا رکن ہوں) لیکن آج تک ہمارا ضمیر اس پر مطمئن نہیں ہے کہ اس چار سالہ نصاب پر آپ کو "شہادۃ العالمیہ" دی جائے۔ وفاق المدارس کے صدر ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کی رائے بھی یہی ہے کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے نہ بخاری پوری پڑھی، نہ مسلم پڑھی، نہ ابوداؤد پوری پڑھی، نہ مشکوٰۃ پوری پڑھی، نہ فقہ کی ساری کتابیں پڑھیں اور نہ منطق وفلسفہ کی۔ آپ کے لئے ایک مختصر سا راستہ نکالا گیا۔ میں اس پر بھی آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چار سالہ تعلیم کے ذریعے آراستہ کیا ہے۔ یہ بھی بہت بڑی دولت ہے۔ آپ قابل قدر ہیں۔ پہلے ہماری بچیوں کو یہ دولت بھی نصیب نہیں تھی لیکن یاد رکھنا اپنے آپ کو آدھا عالم سمجھنا بلکہ میں نے تو ابھی طلبہ سے یہ کہا کہ اپنے آپ کو عالم نہ سمجھنا، طالب علم سمجھنا تو آپ اپنے آپ کو آدھا طالب علم سمجھئے۔

"مدرسۃ البنات" کے متعلق آنے والی شکایات:

ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ جہاں بھی مدرسۃ البنات قائم ہیں، وہاں کے بارے میں یہ بات کثرت سے سننے میں آ رہی ہے۔ سب مدارس اور سب عالمات کے بارے میں نہیں کہہ رہا لیکن بہت سے مدرسوں کی بہت سی عالمات کے بارے میں یہ شکایتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں اور کچھ واقعات بھی میرے سامنے آئے ہیں کہ چونکہ تعلیم ادھوری تھی اس لئے بعض طالبات کو یہ نقصان ہوا کہ ان کے دماغ اونچے ہوگئے۔ اپنے آپ کو اپنے ماں باپ سے بھی بڑا سمجھنے لگیں، اپنے بڑے بہن بھائیوں سے بھی بڑا سمجھنے لگیں کہ ہمارے ماں باپ عالم نہیں، ہم عالمہ ہیں۔ ہمارے بہن بھائی عالم نہیں ہم عالمہ ہیں، حافظ ہیں، قاریہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ کی خدمت جتنی پہلے کیا کرتی تھیں، اب نہیں کرتیں۔ بہن بھائیوں کے ساتھ نرمی اور عجز و انکساری کا جو سلوک پہلے تھا، اب اس میں کمی آنے لگی۔ اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ تو پردہ ڈال دیتے ہیں لیکن سسرال والے تو اس قسم کی باتوں کو برداشت نہیں کرتے، وہ تو چھوٹے سے عیب کو بہت اچھالتے ہیں، پر کا کوا بنا دیتے ہیں۔ اگر وہاں جا کر تمہارا معاملہ اپنے شوہر سے یہی ہوا کہ وہ عالم نہیں اور تم نے اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھا تو کیا ہوگا؟ تم اس کی خدمت کرنے میں عار محسوس کرو گی حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کے کتنے فضائل بیان کئے ہیں۔ ساس، سسر کے ساتھ تمہارا ادب و احترام کا وہ تعلق نہیں ہوگا جو ہمارے ہاں شریف خاندان کی عورتیں کرتی ہیں کہ ان کا ادب و احترام بھی کرتی ہیں اور ان کی خدمت میں بھی کرتی ہیں۔

محبت کا جواب محبت سے ملا کرتا ہے:

شریف لڑکیوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بہو کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے ساس، سسر کی خدمت کرے یا دیور اور نندوں کی خدمت کرے یا ان کی مہمانداریاں کرتی پھرے۔ ان کو کھانا پکا پکا کھلاتی پھرے لیکن اگر ایسا کروگی تو اس کا ثواب آپ ہی کو ملے گا اور پھر پیار کے بدلے پیار ملے گا۔ تم ساس، سسر کو اپنا باپ اور ماں بنا کر رکھوگی تو وہ تمہیں بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ نندوں اور دیوروں کو اپنا بہن بھائی سمجھوگی تو وہ تمہیں اپنی بہن سمجھیں گے۔ محبت کا جواب محبت سے ملا کرتا ہے۔ تکبر کا جواب محبت سے نہیں ملا کرتا۔

ناگوار واقعات:

الحمد للہ، دارالعلوم کراچی کی طالبات کے ایسے واقعات میرے علم میں نہیں آئے اور الحمد للہ اس مدرسے کی بھی ایسی کوئی بات ہم نے نہیں سنی لیکن کئی مدرسوں کی طالبات کے یہ قصے سامنے آئے کہ پہلے اچھی خاصی تھیں لیکن اب لڑکیوں کے اخلاق و کردار میں فرق آگیا۔ نہ ماں باپ کے ساتھ ویسی رہیں اور نہ بہن بھائیوں کے ساتھ وہ سلوک رہا۔ شادی ہوئی تو کچھ ہی دنوں کے بعد میاں بیوی میں تلخیاں شروع ہوگئیں، ساس سسر سے جھگڑے شروع ہوگئے۔ ایک واقعہ ایسا بھی میرے علم میں ہے کہ طلاق ہوگئی اور ایک واقعہ ایسا میرے علم میں ہے کہ طلاق بالکل ہونے والی تھی۔ بیچ میں ہم لوگ پڑ گئے، بہت کچھ سمجھایا، کوششیں کیں۔ تقریباً ایک سال کی کوششوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے طلاق سے بچا لیا مگر ابھی تک ان کی زندگی میں وہ لطف پیدا

نہیں ہوا تو میاں بیوی کی زندگی میں ہونا چاہئے۔

اپنے آپ کو بڑا سمجھنا شیطان کی سنت ہے:

علم ایک نعمت ہے۔ شیطان کوشش کرتا ہے کہ اس کی بنیاد پر تکبر پیدا ہو جائے۔ یاد رکھئے کہ تکبر پیدا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ابھی تک علم نہیں آیا۔ جس کے پاس علم دین آیا کرتا ہے، اس کا سر جھک جایا کرتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جس درخت پر کوئی پھل لگا ہوا نہ ہو تو وہ یوں سیدھا کھڑا ہوتا ہے، تنا ہوا، اس کی ساری شاخیں تنی رہتی ہیں اور جو درخت پھلوں سے لدا ہوا ہو، اس کی ساری شاخیں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ جس کے پاس علم ہوتا ہے اس کا سر جھکا ہوا ہوتا ہے۔ تاجدار دو عالم سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین مکہ نے بے دردی سے تکالیف پہنچائیں۔ آپ اپنے آباء و اجداد کو چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی کفار نے آپ کو چین نہیں لینے دیا۔ کتنی مرتبہ حملے کئے۔ قتل کے منصوبے بنائے۔ سازشیں کیں لیکن جب تاجدار دو عالم سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم فاتح کی حیثیت سے مکہ شہر میں داخل ہوئے تو آپ کا سر مبارک جھکا ہوا تھا۔ تنا ہوا نہیں تھا۔

عزیز طالبات، یاد رکھو! اپنے آپ کو بڑا سمجھنا شیطان کی سنت ہے۔ شیطان بہت بڑا عالم تھا۔ اتنا بڑا عالم کہ بعض فرشتوں سے بھی اس کا علم زیادہ تھا لیکن تکبر کی وجہ سے مردود ہوا۔ اس لئے اگر کوئی تکبر کا شبہ ہو تو اُسے نکال دو اور کسی اللہ والے سے رشتہ جوڑو۔

بہشتی زیور کو اپنا مشعل راہ بناؤ

اس سلسلے میں آپ کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ بہشتی زیور کے ساتویں حصہ میں

پیری مریدی اور باطن کی اصلاح سے متعلق مضامین اور کافی تفصیلی کلام ہے۔ آپ اسے غور سے پڑھیں۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے پوچھیں پھر ان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں۔ میں آپ سے ایک اور بات کہوں (پتہ نہیں آپ اس کی قدر کریں گی یا نہیں؟ کہیں آپ اس میں اپنی توہین نہ سمجھنے لگیں) وہ بات یہ ہے کہ الحمدللہ آپ نے پڑھا تو بہت کچھ ہے لیکن عملی زندگی میں اس سب کا سب لباب وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہوا ہے۔

بہشتی زیور کو اپنا مشغلہ بنا لو، از اول تا آخر بہشتی زیور کا مطالعہ کرو۔ صرف ایک مرتبہ مطالعہ کافی نہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ہماری بہنوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ شروع سے آخر تک پڑھا کرو۔ جب ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ شروع کر دو۔

میں نے آپ کو اپنی بیٹیاں سمجھ کر خطاب کیا ہے۔ امید ہے کہ میری یہ باتیں آپ کی دل شکنی کی بجائے باعث تقویت ہوں گی۔

یہ مفتی بننے کی سند نہیں

تخصص سے فارغ ہونے والے ساتھیوں سے بھی ایک بات عرض کرنی ہے اور وہ یہ کہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ پورے ملک میں چار پانچ ہی تو مفتی ہیں۔ جب کسی مسئلے میں اجتماعی غور و فکر کی ضرورت پیش آتی ہے تو چار، پانچ سے زیادہ مفتی نظر نہیں آتے۔ جب ہمارا تخصص کا نصاب پورا ہونے لگا تو فرمایا، یاد رکھو! ہم جو تمہیں سند دے رہے ہیں۔ وہ اس بات کی سند نہیں کہ تم مفتی ہو گئے، بلکہ ہم اس بات کی سند دے رہے ہیں کہ تم نے تخصص فی الافتاء کا نصاب اپنے استادوں کی زیر نگرانی باقاعدہ پڑھ لیا اور اس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ابھی مفتی نہیں

بنے۔ مفتی اس وقت ہو گے جب سالہا سال کسی ماہر مفتی کی ماتحتی اور نگرانی میں رہ کر انکی ہدایات کے مطابق فتوے لکھتے رہو گے۔ انہیں دکھاتے رہو گے، وہ ان کی اصلاح کرتے رہیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ جب وہ تمہارے فتوے پر اطمینان کرنے لگیں تو پھر تم مفتی کہلاؤ گے۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں تخصص کیا اور پھر والد صاحب کی تربیت میں کام کرتا شروع کیا۔ حضرت والد صاحب کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا (یعنی سولہ سال بعد) اس وقت تک وہ میرے نام کے ساتھ مفتی نہیں لکھتے تھے۔ مجھے "نائب مفتی" کہتے تھے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب کو بھی "نائب مفتی" کہتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کا واقعہ

۱۹۶۰ء میں والد صاحب کے ساتھ جنوبی افریقہ جانا ہوا تو پورے ملک میں عالم ہی دو تین تھے، وہ بھی ہندوستان کے تھے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ۱۹۷۷ء میں جانا ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ اتنے مفتی ہیں کہ ہر گاؤں میں ایک مفتی مل جاتا ہے۔ جہاں جائیں، مفتی صاحب مل جاتے تھے۔ حیرانگی ہوئی کہ گیارہ سال میں کیا انقلاب آگیا کہ صرف علماء ہی نہیں، یہاں مفتی اتنے زیادہ پیدا ہو گئے۔ جتنے شہر اتنے مفتی، جتنے گاؤں اتنے مفتی۔ شوق پیدا ہوا کہ جا کر ان سے ملاقات کریں۔ جا کر دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے مفتی بنے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کوئی کارخانہ لگا ہوا ہے جو ایک سال میں مفتی بنا دیتا ہے، اور بڑی تعداد میں اس کی پروڈکشن (Production) چل رہی ہے۔

اب ہمارے ملک میں آپ دیکھ لیں۔ مفتیوں کی تعداد کتنی زیادہ ہو چکی ہے۔ تخصص فی الافتاء میں داخلہ ملتے ہی مفتی کہلانا شروع ہو جاتے ہیں حالانکہ ابھی

تک تخصص کی تربیت بھی حاصل نہیں کی ہوتی۔ اور فارغ ہونے کے بعد تو باقاعدہ اپنے نام کے ساتھ بریکٹ میں "مفتی" کا لفظ لکھتے ہیں۔ بریکٹ میں اس لئے لکھتے ہیں تاکہ دیکھنے والا یوں سمجھے کہ کسی اور نے لکھ دیا ہے حالانکہ لکھتے خود ہی ہیں۔

مفتی بننے کا طریقہ

خدا کے لئے دل سے یہ بات نکال دیجئے کہ آپ مفتی ہو گئے۔ ہرگز خیال نہ کیجئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے جو تربیت حاصل کی، وہ بے کار چلی گئی۔ نہیں نہیں، وہ بہت قیمتی چیز ہے، بنیاد تیار ہو گئی۔ اب اس بنیاد پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی ماہر مفتی کی ماتحتی میں رہ کر کام کیجئے۔ وہ تمہاری غلطیاں بتائے گا اس پر خوش ہوئیے، برا نہ مانئے۔ بعض ایسے متکبر بھی ہوتے ہیں کہ استاد غلطی نکالتا ہے تو کہتے ہیں کہ ایسے بے کار میں غلطی نکالی ہے، ایسے لوگوں کی کبھی اصلاح نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو محتاج سمجھ کر اپنے فتووں کی اصلاح لیتے رہئے اور جب وہ اصلاح کریں تو اس پر ان کے ممنون ہوئیے۔ اس طرح کرنے سے کچھ عرصے کے بعد آپ کے فتوے اس قابل ہو جائیں گے کہ علماء اس پر اعتماد کرنے لگیں۔

ہمارا حال

اس وقت ہمارا حال وہ ہو گیا ہے جو "اشعب طماع" کا تھا۔ "نفحۃ العرب" میں اس کا قصہ مذکور ہے۔ "اشعب طماع" لالچی بہت تھے، اتنے لالچی تھے کہ ان کا لالچی ہونا ضرب المثل بن گیا تھا یہاں تک کہ ان کے نام کے ساتھ "طماع" (لالچی) کا لقب لگ گیا ہے۔ چونکہ واقعۃً لالچی تھے، اس لئے بچے بھی ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے۔ بچوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ان کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر

ان سے کہا کہ فلاں کے گھر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، تم وہاں کیوں نہیں جاتے۔ جیسے ہی بچوں نے یہ سنا، وہ اس مکان کی طرف بھاگ پڑے۔ بچوں کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ پڑے، لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کہنے لگے کیا خبر! واقعی تقسیم ہو رہی ہو۔ ایسا ہی ہمارا معاملہ ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو مفتی لکھنا شروع کیا۔ جب لوگوں نے مفتی کہنا شروع کیا تو سوچنے لگے کیا خبر! واقعی مفتی ہو گئے ہوں۔

قرآن مجید ختم کرنے کا مسنون طریقہ:

اب ایک بات درجہ حفظ و ناظرہ اور درجہ تجوید و قرأت کے طلبہ و طالبات سے کہنی ہے۔ الحمدللہ، آپ نے قرآن مجید مکمل کیا ہے۔ کسی نے حفظ، کسی نے ناظرہ اور کسی نے تجوید و قرأت کے ساتھ۔ اس موقع پر میں آپ کو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ سناتا ہوں۔ اس ملفوظ سے پہلے جو بات وہ تمہید کے طور پر فرمایا کرتے تھے، وہ سناتا ہوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ختم قرآن کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ جب سورۃ الناس پڑھتے ہیں تو فوراً اسی مجلس میں الحمدللہ سے شروع کر کے الم سے "اولٰئک ھم المفلحون" تک پڑھتے ہیں۔ یہ ختم قرآن کا مسنون طریقہ ہے۔ جب اپنے طور پر قرآن مجید کی تلاوت کریں، اس کا بھی مسنون طریقہ یہی ہے۔ حدیث میں "حالاً مرتحلاً" کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ "اترتے ہی فوراً سواری پر سوار ہو گئے"۔ یعنی قرآن مجید ختم کرتے ہی دوبارہ شروع کر دو۔

اپنی زندگیاں قرآن میں ختم کر دو

اس مسنون طریقہ ختم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب جو نیا

شروع کیا، اسے بھی پورا کرو۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سنت کا حوالہ دے کر فرمایا کرتے تھے کہ "یاد رکھو! قرآن مجید ختم کرنے کی چیز نہیں ہے۔ اپنی زندگیوں کو قرآن میں ختم کرنا ہے"۔

حفاظ قرآن پر اکی ذمہ داری اور زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال فرمایا، انہیں یہ قدرت بھی دے دی کہ وہ چلتے پھرتے بھی قرآن مجید پڑھ سکتے ہیں، اس زیور کو اپنے ساتھ رکھو۔ قرآن ایک ایسا رفیق ہے کہ جس کے ساتھ ہو جائے، وہ کبھی تنہا نہیں رہتا۔

اجازتِ حدیث (طلبہ کی طرف سے درخواست پر فرمایا)

میں آپ کو ان تمام کتب حدیث کی اپنی سند سے روایت کرنے کی اجازت دیتا ہوں جو میں نے اپنے اساتذہ سے پڑھی ہیں یا کی ہیں یا جن کی اجازت مجھے بزرگان حدیث نے مرحمت فرمائی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اپنی سند بھی مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں نے مسلم شریف مولانا اکبر علی صاحب نور اللہ مرقدہ سے پڑھی ہے جو وفات تک دارالعلوم کراچی میں استاذ رہے۔ اس سے پہلے مظاہر العلوم سہارنپور میں جلیل القدر استاذ تھے۔ انہوں نے مولانا منظور احمد صاحب سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے پڑھی۔ حضرت سہارنپوریؒ کی سند مشہور و معروف ہے۔

بخاری شریف حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب جالندھریؒ سے پڑھی ہے۔ انہوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اسناد مشہور و معروف ہیں۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے موطا امام مالک، شمائل ترمذی درساً پڑھی

ہے۔ اور حصن حصین کی اجازت ان سے حاصل ہے۔ انہیں حصن حصین کی اجازت حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھی۔ اور یہ میری اعلیٰ ترین سند ہے کیونکہ اس میں میرے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان صرف تین واسطے ہیں۔

۱۔ میرے والد ماجد قدس سرہ

۲۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ اور حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ

مجھے جن بزرگوں سے اجازت حدیث حاصل ہے، ان میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب اعلاء السنن شامل ہیں، انہوں نے مجھے روایت حدیث کی اجازت عامہ مطلقہ عطا فرمائی ہے۔

اسی طرح درساً پڑھنے کے علاوہ تمام مرویات کی اجازت مجھے اپنے والد ماجد سے بھی حاصل ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کی تمام مرویات کی اجازت حاصل ہے۔ اسی طرح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے صحاح ستہ کی اجازت حاصل ہے، جو انہوں نے تحریری طور پر دارالعلوم کراچی عطا فرمائی اور میں نے چونتیس کتابوں کے اطراف بھی ان کے پاس پڑھے ہیں۔ انہوں نے ان کی بھی اجازت حدیث مسلسل میں عطا فرمائی۔ اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مجھے روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے۔

ان کے علاوہ شیخ محمد حسن بن مشاط المکی المالکی المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ سے بھی اجازت حاصل ہے۔ مکہ مکرمہ میں ۶۳ء میں جب پہلی مرتبہ حاضری ہوئی، میرا پہلا حج تھا۔ وہاں اس وقت وہ مسجد حرام میں مدرس تھے۔ فقہ مالکی کے جلیل القدر فقیہ

اور محدث تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی تمام مرویات کی زبانی اور تحریری بھی اجازت عطا فرمائی اور اپنا سبط بھی عطا فرمایا۔

حدیث "مسلسل بالاولیۃ"

انہوں نے مجھے حدیث "مسلسل بالاولیۃ" بھی سنائی تھی۔ وہ میں آپ کو بھی سنا دیتا ہوں۔ اس کا متن یہ ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ﴾

یہ حدیث مجھ سے لے کر حضرت سفیان بن عیینہ تک "مسلسل بالاوّلیۃ" ہے۔ آگے اس کا "تسلسل بالاولیۃ" ختم ہو گیا ہے۔

یہاں ایک بات آپ سے یہ عرض کر دوں کہ اگرچہ یہ حدیث "مسلسل بالاوّلیۃ" ہے اور میں نے آپ کو سنا کر اسکی اجازت بھی دے دی ہے لیکن یہ حدیث میری زبان سے آپ کے لئے "مسلسل بالاولیۃ" نہیں رہی کیونکہ آج ہی کے خطاب میں پہلے اور کئی حدیثیں میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ لہٰذا آپ کو مجھ سے "تسلسل بالاوّلیۃ" حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ کسی اور ایسے استاذ کو تلاش کیجئے جس نے پہلے آپ کو کوئی حدیث نہ سنائی ہو اور وہ سب سے پہلے یہ حدیث آپ کو سنائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان روایات اور بزرگوں کی برکات سے مالا مال فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ○

ہماری پریشانیاں اور ان کا حل

قرآن و حدیث کی دعاؤں کی روشنی میں

مؤلف

شیخ محمد صدیق المنشاوی

اردو ترجمہ

ابواب الفرج

مولانا خالد محمود
فاضل جامعہ اشرفیہ

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ۔ پرانی انارکلی لاہور۔ فون [illegible]

رحمتِ دو عالم ﷺ
اور
اسلامی اخلاق

تالیف

حضرت مفتی محمد فاروق صاحب مدظلہ العالی

(استاذ جامعہ محمودیہ میرٹھ انڈیا)

بیت العلوم